ناول سکین بائ محمد ندیم

ناول PDF بائ محمدندیم

فار ون اردوڈاٹ کام

nadeemq@oneurdu.com

حالات بائے برہم

محی الدین نواب

عزائم انسان کے ہوں یا کسی بڑی عالمی طاقت یا کسی بڑی ریاست کے..... ان کے پیش نظر صرف اور صرف اپنا مفاد ہوتا ہے..... چاہے اپنے دیرینہ خواب اور تعیشات کی تکمیل کے لیے انہیں کیسا ہی طریقہ کار کیوں نہ اختیار کرنا پڑے..... ایسی ہی عالمی طاقتوں کا کھیل جو اپنی طاقت و مفادات کو قائم و دائم رکھنے کے لیے حالات میں بگاڑ پیدا کرکے انسانیت کو خس و خاشاک کی طرح روندتے جارہے تھے۔ عالمی حالات کے تناظر میں رونما ہونے والی سیاسی فکری اور نظریاتی تبدیلیوں کی غماز.....

ناانصافیوں..... ناہموار زندگی کی مشکلات..... عشق جمال اور امن کے جذبوں کی عکاس

رات کا سفر اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا کہ ایک پولیس وین اس وسیع و عریض عمارت کے سامنے آکر رک گئی۔ امریکی اس عمارت کو "ڈیتھ ہاؤس" کہتے تھے اور مقامی زبان میں اسے دارالاجل کہا جاتا تھا جہاں سانس لیتی ہوئی زندگیاں دم توڑ رہی تھیں۔

دارالاجل میں سزائے موت پانے والے قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔

اس پولیس وین کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ قاضی ابرار ہاشمی وین سے باہر آیا۔ وہ جیل خانے کی مسجد کا پیش امام تھا۔ اکثر سزائے موت پانے والے قیدیوں کی وہ آخری نماز پڑھاتا تھا۔ انہیں قرآن مجید کی آیات سناتا تھا۔ پھر سپاہی ان قیدیوں کو پھانسی کے تختے پر یا گیس چیمبر میں لے جاتے تھے۔

اذان ہورہی تھی اور ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ شہری سو رہے تھے اور سوتے سوتے جاگ رہے تھے۔ دور و نزدیک سے فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ایک آدھ بار بم کے دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔ پورے عراق میں موت چیختی چنگھاڑتی پھرتی..... تھی اور وہ سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے اللہ کو پکارتے رہتے تھے۔

مارچ 2003ء کو امریکا کی اتحادی افواج نے حملہ کیا تھا۔ امریکا' برطانیہ اور دیگر بڑے ممالک اپنی پوری طاقت کے ساتھ گرجتے برستے تھے مگر خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہورہا تھا۔ موت ان کے بیرکوں میں بھی گھسی چلی آتی تھی۔

دور کہیں بم بلاسٹ ہوا اور تاریکی میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا..... قاضی ابرار ہاشمی نے سر گھما کر ادھر دیکھا اور پولیس افسر کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

وہاں ایک کمرے میں قاضی صاحب کے شناختی کاغذات چیک کیے گئے۔ پھر ان سب کو آگے جانے کی اجازت دی گئی۔ ان کے ساتھ آنے والے جیلر اور سپاہیوں نے آگے بڑھ کر آہنی سلاخوں والا ایک دروازہ کھولا۔ وہ اس دروازے سے گزر کر آگے بڑھے تو پچھلا دروازہ بند ہوگیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دوسرا دروازہ کھل گیا۔

وہ دوسرے دروازے سے گزر کر ایک راہداری میں آئے جس کے اطراف میں تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ ہر کوٹھری میں ایک قیدی تھا۔ وہ سب ہی اپنی موت کی مقررہ تاریخ کا انتظار کررہے تھے۔

قاضی ابرار ہاشمی پولیس افسر اور سپاہیوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک کوٹھری کے سامنے آکر رک گیا۔ صبح کی اذان ہوچکی تھی۔ ایک قیدی سراج مصطفیٰ تنگ کوٹھری میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ابرار ہاشمی نے بھی سلاخوں سے باہر نماز ادا کی۔ جیلر' پولیس افسر اور سپاہی چپ چاپ ایک دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

پھر ایک بم دھماکا سنائی دیا۔ موت صرف اس مقام مرگ میں نہیں تھی۔ اس عمارت کے باہر شہر اور پورے عراق میں دندناتی پھررہی تھی۔ مرد عورتیں' بچے اور بوڑھے سب ہی سہمی ہوئی زندگی گزار رہے تھے۔ کبھی کسی اشد ضرورت کے تحت مجبور ہوکر گھر

پڑھتے ہوئے گھروں سے نکلتے تھے۔ ورنہ دروازے کھڑکیاں بند کرکے اپنی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔

نماز کے بعد اسسٹنٹ جیلر نے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا۔ پولیس افسر اور سپاہیوں نے اپنی اپنی گن کا رخ سراج مصطفیٰ کی طرف کردیا۔ یہ دھمکی تھی کہ وہ قاضی صاحب کو نقصان پہنچائے گا تو اسے گیس چیمبر میں لے جانے سے پہلے گولیوں سے زخمی کرکے اپاہج بنا دیا جائے گا۔

سپاہیوں نے کوٹھری میں جاکر سراج کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر مضبوطی سے باندھا اور محتاط انداز میں اسے گن پوائنٹ پر رکھا۔ پھر قاضی ابرار ہاشمی نے اندر آکر کہا۔ ''السلام علیکم...''

اس نے جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام...''

قاضی نے کہا۔ ''تمہیں اللہ تعالیٰ سلامتی اور سکون دے گا۔''

وہ خشک لہجے میں بولا۔ ''نہیں دے گا۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ ہم سب کے لیے بہتری کرتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''بے شک! اس معبود کی رضا سے موت مل رہی ہے۔ یوں ہم محبانِ وطن کی قربانیاں عراقی قوم کو جھنجوڑ رہی ہیں۔''

قاضی ابرار ہاشمی نماز پڑھنے کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھ کر کلام پاک کی ایک آیت پڑھنے لگا۔ سراج مصطفیٰ نے کہا۔ ''میں مجاہد ہوں۔ میرے ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں تو میں تن کر کھڑا ہوا ہوں۔ تم سب عراق میں امریکا کی پٹھو حکومت کے غلام ہو۔ اس لیے تمہارے ہاتھ غلاموں کی طرح آگے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا مقدس آیات پڑھتے وقت تمہاری زبان نہیں لڑکھڑاتی؟''

سزائے موت پانے والے ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ انہیں موت کی طرف لے جانے والے ہرکارے ایک کان سے سنتے تھے دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ وہ اسے ایک بڑے سے ہال میں لے آئے۔ وہاں اسٹیل سے بنا ہوا ایک گیس چیمبر تھا۔ اس کے ہر طرف دبیز شیشوں کی دیواریں تھیں۔ ایک اونچا اسٹیل کا روشن دان تھا جو موت کے گھر سے باہر کھلتا تھا تاکہ سزا کے عمل کے بعد گیس باہر نکل جائے۔

وہ چیمبر تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا۔ اس کے وسط میں ایک اسٹیل کی کرسی تھی جس میں ہاتھوں اور پیروں کو کسنے کے لیے چرمی بیلٹ لگی ہوئی تھی۔

سائنائڈ کرسی کے نچلے حصے میں رکھا ہوا تھا۔ اس مقامِ مرگ کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے دیکھنے والے خود اس کرسی پر بیٹھے ہوں۔ اس تصور سے ہی کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

سراج مصطفیٰ ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اسے ٹارچر سیل میں رکھا گیا تھا۔ بڑی اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ وہ زخموں سے چُور تھا۔ چہرے کی سوجن کے باعث اور بھی بھاری بھرکم لگ رہا تھا۔ وہاں اس کے ساتھ جو ہونے والا تھا، وہ اسے اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔ وہ موت سے پہلے ہی اندر سے خالی ہو چکا تھا۔

وارڈن نے سیکیورٹی افسر کے پاس آکر کہا۔ ''اوکے...!''

سپاہیوں نے چھوٹے سے سیل کا دروازہ کھولا۔ سراج کا جسم تن گیا۔ وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ گارڈ نے اسے بازو سے پکڑا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جی دار بڑا تھا، حوصلے سے چلتا ہوا سیل سے باہر آگیا۔

وارڈن جیسے جان چھڑانے کے انداز میں ڈیتھ وارنٹ پڑھنے لگا۔

''سراج مصطفیٰ ولد غلام مصطفیٰ! چھ نومبر 2006ء کی شام تمہاری والدہ اُمِ حفصہ نے اتحادی فوجیوں کے دو ٹرکوں کے درمیان آکر خودکش حملہ کیا جس کے نتیجے میں چھ فوجی ہلاک اور بیس زخمی ہوئے۔

''سراج مصطفیٰ! عینی گواہوں اور ٹھوس ثبوت کے مطابق تم ماں بیٹے القاعدہ کے لیے کام کرتے رہے۔ تمہاری گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا۔ تم دس نومبر کو سفارت خانے کے سامنے ایک کار میں بم رکھ کر فرار ہو رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس وقت بم دھماکے سے سفارت خانے کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ ایک چوکیدار مارا گیا اور چھ افراد زخمی ہوئے۔

''عراقی عدالتِ عالیہ نے تمام ٹھوس ثبوت اور چشم دید گواہوں کے بیانات کے مطابق تمہیں سزائے موت دی ہے جس پر عمل کیا جارہا ہے۔''

موت کے منہ میں سراج جارہا تھا لیکن ڈیتھ وارنٹ پڑھتے وقت وارڈن کے ماتھے پر پسینا چمک رہا تھا۔ اس نے سراج سے پوچھا۔ ''کوئی آخری بات...؟''

اس نے کہا۔ ''میری طرح تم سب عراقی ہو۔ شرم کرو اور امریکا کی غلامی سے باز آجاؤ۔''

گارڈ نے اسے دھکیلتے ہوئے چیمبر میں پہنچا دیا۔ وہاں اسے ایک اسٹیل کی کرسی پر بٹھایا گیا۔ چرمی بیلٹ کس دیے گئے۔

ایک گارڈ نے سلفیورک ایسڈ کو ایک مٹی کے برتن میں لاکر رکھ دیا۔ کرسی کے نچلے حصوں میں پھڑے لگے ہوئے تھے۔ ٹھیک ان کے نیچے اس برتن کو رکھا گیا۔

وارڈن نے بیلٹس کا معائنہ کیا۔ ایک بیلٹ سراج کے سینے کے گرد بندھی ہوئی تھی۔ باقی بیلٹس دونوں ہاتھوں اور پیروں کو جکڑے ہوئے تھیں۔

وہ اپنا ہاتھ سراج کے کندھے پر رکھ کر بولا۔ ''تم جلدی

چلے جاؤ گے جوان! بس ایک لمبی سانس کھینچنا۔ تمہیں کچھ پتا نہیں چلے گا۔''

وہ چیمبر سے باہر آگیا۔ سراج وہاں تنہا رہ گیا۔ شیشے کا مضبوط دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے بولٹ کس دیے گئے۔

وارڈن کی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر تھی۔ دس سیکنڈ کا انتظار تھا اور یہ دس سیکنڈ نظارہ کرنے والوں کے دل دھڑکا رہے تھے۔ صدیاں گزر جاتی ہیں۔ دس سیکنڈ گزرنے میں بھلا کیا دیر لگتی؟ وارڈن کے اعصاب تن گئے۔ اس نے ایک جھٹکے سے لیور نیچے کر دیا۔ ننھے پھڑے مٹی کے برتن میں گرنے لگے۔ سراج نے ان کی آوازیں سنیں اور کرسی پر تن گیا۔ پھڑے برتن میں گر رہے تھے اور سفید گیس تیزاب میں سے نمودار ہو رہی تھی۔

تب وہ اپنے ہاتھوں کو کرسی سے جکڑی ہوئی بیلٹس سے آزاد کرنے کی کوششیں کرنے لگا۔ گیس تیزی سے پھیل رہی تھی۔ وہ اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکرانے لگا۔ وہ دھوئیں سے بچنا چاہتا تھا' سانس لینا نہیں چاہتا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا۔

وہ سانس روک کر موت کو قبول کرنے سے پہلے زندگی کو مشکل بنا رہا تھا۔ وہ لاکھ سر پٹختا مگر سانس نہیں روک سکتا تھا۔ اسے تو موت ہی روکنے والی تھی۔

پھر یہی ہوا... اس نے مجبور ہو کر ایک لمبی سانس کھینچی اور گیس کی بھاری مقدار اس کے پھیپھڑوں میں پہنچ گئی۔ وہ بڑے کرب سے چیخ پڑا۔ اس کی چیخیں چیمبر کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں... بکھرتی ہوئی اور گونجتی ہوئی معدوم ہو رہی تھیں۔ وہ گیس جو مٹھی کی گرفت میں بھی نہیں آتی' وہ چیمبر کے اندر ٹھہری ہوئی تھی اور باہر نکلنے سے معذور تھی۔

وہ کراہ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔ ڈاکٹر کی نظریں اسٹاپ واچ پر تھیں۔ تیس سیکنڈ... چالیس سیکنڈ... پھر پچپن سیکنڈ اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

ڈاکٹر نے اپنے سامنے رکھے ہوئے چارٹ پر وقت کا اندراج کیا۔ سراج غافل ہو چکا تھا۔ اس کا سر بائیں شانے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس نے کھانسنا بند کر دیا تھا۔ دھوئیں سے چیمبر بھر گیا تھا اور وہ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر ابھی اس کو اور کبھی اسٹاپ واچ کو دیکھ رہا تھا۔ بہت آہستہ آہستہ اس کا سر شانے سے اٹھا پھر سینے کی طرف ڈھلک گیا۔ لمبے بال اس کی پیشانی اور آنکھوں پر آگئے۔

ایک منٹ اور گزر گیا۔ پھر سب کچھ تھم گیا۔ ڈاکٹر نے آہستگی سے کہا۔ ''ہم سب کو اپنے رب کی طرف جانا ہے اور یہ جا چکا ہے۔''

وہ موت کا سرٹیفکیٹ لکھنے لگا۔

☆☆☆

وہ پندرہ برس کا تھا اتنی سی عمر میں پندرہ افراد کو بے موت مرتے دیکھ چکا تھا۔ بغداد کی چھوٹی بڑی شاہراہوں میں' چوراہوں، محلوں اور گلیوں میں لوگ دن رات کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے رہتے تھے۔ گولیاں چلتی تھیں اور بم دھماکے ہوتے رہتے تھے۔ اس نے کبھی گھر کی چھت سے اور کبھی اسکول سے آتے ہوئے موت کے یہ بھیانک تماشے دیکھے تھے۔

لوگ گھروں سے نہیں نکلتے تھے۔ اسکول اور دیگر تعلیمی ادارے بند ہو گئے تھے۔ سہمے ہوئے بچے گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے۔ اس کا باپ دائمی مریض تھا۔ پورے ملک میں دواؤں اور خوراک کی کمی تھی۔ مہنگی اور موثر دوائیں تو کیا' پانی ملی ہوئی دوائیں بھی نصیب نہیں تھیں۔ اس کا باپ بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

اس کی ماں اُمِ حفصہ اور بڑا بھائی سراج مصطفیٰ مجاہدین کے گروہ سے تعلق رکھتے۔ پانچ نومبر 2006ء عراقی ہائی ٹریبونل نے صدام حسین کو سزائے موت کا حکم سنایا تو عوام کی جانب سے ملا جلا ردِعمل ظاہر ہوا۔ اس حکم کے بعد خاموشی بھی رہی اور کسی قدر ہنگامے بھی ہوئے۔

صدام حسین کے حامیوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اُمِ حفصہ نے خودکش جیکٹ پہن کر جان دی۔ اپنے ساتھ چھ امریکی فوجیوں کی جانیں بھی لیں اور بیس فوجی جوانوں کو زخمی اور اپاہج بنا دیا۔

ماں نے چھ نومبر کو جان دی۔ بڑا بھائی سراج مصطفیٰ دس نومبر کو کار بم دھماکا کرتے وقت پکڑا گیا۔ پندرہ دنوں کے بعد ہی اسے سزائے موت دے دی گئی۔ گیس چیمبر میں اس کی زندگی تمام ہو گئی۔ اب اس خالی گھر میں وہی پندرہ برس کا لڑکا رہ گیا تھا۔

پڑوس میں دو جوان بہنیں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھیں۔ بڑی بہن سلیمہ کی شادی ہو گئی تھی۔ گھر داماد عبدالمعنم بڈحرام تھا۔ اپنا زیادہ وقت بیوی کے ناز نخرے اٹھانے میں صرف کرتا تھا۔

دوسری بہن یاقوت العزیزی ڈاکٹر تھی۔ ہاؤس جاب کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ آرمی اسپتال میں ڈیوٹی انجام دیتی تھی اس لیے ہفتے میں دو دن کے لیے گھر آتی تھی۔ پولیس کی گاڑی اسے گھر لاتی اور اسپتال لے جاتی تھی۔

جو لوگ امریکا اور اس کی کٹھ پتلی حکومت کے لیے کام کرتے تھے، مجاہدین انہیں خاص طور پر نشانہ بناتے تھے۔ پولیس کی نگرانی میں آنے جانے والوں پر حملے کرتے تھے۔ یاقوت العزیزی پر بھی دو بار ناکام حملے کیے گئے تھے لیکن وہ محفوظ رہی۔ وہ پُراعتماد انداز میں آتی جاتی تھی۔

اعتماد کی وجہ یہ تھی کہ مجاہدین جان بوجھ کر ناکام حملے کرتے تھے اور فرار ہو جاتے تھے۔ اس کی جان نہیں لیتے تھے کیونکہ وہ درپردہ ان کے لیے جاسوسی کے فرائض ادا کرتی تھی۔

اس کی مخبری کے باعث مجاہدین نے پچھلے تین برسوں میں سات کامیاب حملے کیے اور اتحادی فوج کے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔

وہ دی لائن آف اللہ بریگیڈ کے مجاہدین صدام حسین کے حامی نہیں تھے اور اسے ایک آمر فرعون کہتے تھے۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں سے بھی نفرت کرتے تھے۔ انہیں وہاں سے مار بھگانا چاہتے تھے اور امریکا کی جی حضوری کرنے والے موجودہ عراقی حکمرانوں پر لعنت بھیجتے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک اسلامی جمہوری حکومت کے قیام کی آرزو تھی۔ وہ ملک میں خانہ جنگی اور بڑھتے ہوئے جرائم کو ختم کرنے کے لیے مسلسل جہاد کر رہے تھے۔

یاقوت العزیزی بڑی رازداری سے ان کے لیے کام کر رہی تھی۔ وہ پڑوس میں رہنے والے لڑکے وسیم کو اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ تمام دن اس فیملی کے ساتھ رہتا۔ رات کو سونے کے لیے یاقوت کی ماں اور باپ کے ساتھ اپنے گھر آجاتا تھا۔ چونکہ کوئی رات کو باہر نہیں نکلتا تھا اس لیے آنے جانے کے لیے دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ بنا دیا گیا تھا۔

وسیم بچپن ہی سے یاقوت کو بہت چاہتا تھا۔ جب وہ آٹھ برس کی تھی اور وسیم ڈیڑھ برس کا تھا تو وہ اسے گود میں لیے پھرتی تھی۔ جب وہ لکھنے پڑھنے کے قابل ہوا تو اسے اپنے پاس بٹھا کر پڑھاتی تھی۔ محلے کے بچے گلیوں میں کھیلتے رہتے، وہ اس کے آنگن میں آ کر شرارتیں کرتا رہتا۔

یاقوت نے کئی بار پوچھا۔ ”باہر کیوں نہیں جاتے؟ لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرو۔“

وہ کہتا۔ ”تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ تمہیں چھوڑ کر اسکول جاتا ہوں تو وہاں بھی تمہاری یاد آتی رہتی ہے۔“

وہ اس کی بات پر ہنس پڑتی۔ اس کی معصوم چاہت اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ نہ اتحادی فوجوں نے حملہ کیا تھا' نہ ٹارگٹ کلنگ تھی۔ نہ خودکش حملے تھے۔ نہ موت گلی کوچوں میں دندناتی پھرتی تھی۔

اس موت نے ایک معصوم لڑکے سے لہو کے تمام رشتے چھین لیے تھے۔ یاقوت پہلے سے زیادہ اس کی محبت کا مرکز بن گئی۔ وہ ہفتے میں دو دن کے لیے اسپتال سے گھر آتی تو زیادہ سے زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزارتی اور رات کو اسے سلانے کے بعد اپنے بستر پر آتی۔

پہلے اسے سلاتے وقت کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ وہ کہانیاں جگ بیتی ہوتی تھیں۔ اب اسے آپ بیتی سنانے لگی اور اسے سمجھاتی۔ ”اب تم بچے نہیں رہے۔ اپنے ملکی حالات کو دیکھو... سمجھو۔ ہمیں آزادی کے لیے نہ جانے کتنے عرصے تک جنگ لڑنی ہوگی؟ شاید ہم بوڑھے ہو جائیں گے اور شاید میں بھی شہید ہو جاؤں۔ پھر...“

وسیم نے آگے کچھ کہنے سے پہلے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسی باتیں نہ کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ شہید ہو جاؤں گا۔ زندہ نہیں رہوں گا۔ تمہارے بغیر ایک سانس بھی نہیں لوں گا۔“

وہ بول رہا تھا اور وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ اس کے منہ پر ایک بھاری بھرکم' سخت مردانہ ہاتھ رکھا ہے۔ وہ کوئی نو عمر لڑکا نہیں ہے۔

کمرے میں تقریباً اندھیرا تھا۔ کھڑکی ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ بجھی بجھی سی چاندنی میں وہ سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

وہ دن کے وقت بھی اسے چھو لیتا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا مگر تاریکی اور تنہائی بڑی طلسماتی ہوتی ہے۔ وہ احساسات کو الٹ پلٹ کر رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہے۔ یاقوت نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اسے اپنے منہ پر سے ہٹا دیا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ وسیم سے متاثر ہوگئی تھی۔ نہیں... وہ اچانک ہی اپنے حارث کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اسے بھاری بھرکم اور پتھر جیسے سخت ہاتھوں کی گرفت یاد آگئی۔ حارث نے اس کے دونوں بازوؤں کو جکڑ لیا تھا پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

وہ کسمسانے لگی۔

کہاں سے کہاں پہنچ گئی؟

وسیم نے نیم تاریکی میں اس کی بے چینی کو محسوس کیا پھر پوچھا۔ ”سسٹر! کیا ہوا؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”کچھ نہیں۔ میں کہہ رہی تھی' ہم عراقی اپنی تاریخ کے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ غاصبوں نے ہمارے خود غرض اور لالچی سیاست دانوں کو خرید لیا ہے۔ بظاہر عراقی حکمران ہیں لیکن اُن حکمرانوں کی لگام امریکا کے ہاتھ میں ہے۔“

وسیم نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ہم دشمنوں کو مار بھگائیں گے۔ میں بھی بڑا ہو کر ان کے خلاف جنگ لڑوں گا۔“

وہ موجودہ عمر سے بڑا ہونے کی بات کر رہا تھا جبکہ وہ اپنا ہاتھ حارث کے ہاتھوں میں محسوس کر رہی تھی۔ عجیب سی بات تھی' عجیب سے احساسات تھے' وسیم کے بڑا ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔

وہ اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔ ”امریکا اور اس کے اتحادی ہمارے دشمن ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ہم خود اپنے دشمن ہیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”وہ کیسے...؟“

”ہمیں غلام بنائے رکھنے کے لیے دنیا والوں کو دکھایا جا رہا ہے کہ یہاں ہم عراقی حکمران ہیں۔ اس کٹھ پتلی حکومت کی عدالتوں میں امریکا کا قانون ہے اور امریکی مفادات کے مطابق فیصلے سنائے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی پولیس ہمیں مارتی اور کچلتی ہے اور غاصبوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔“

وسیم نے ذرا قریب ہو کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ پولیس والے...“

وہ جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”دور رہو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟“

”میں کیا کروں؟ تم بہت اچھی لگتی ہو۔ بہت نرم نرم سی...“

وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سایہ اپنی عمر سے' اپنی جسامت سے بڑا ہو گیا تھا... سائے تو روشنی کی قربت اور دوری سے سکڑتے اور پھیلتے ہیں۔ وہ پھیل رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”اب میں تمہارے پاس آتا ہوں تو تمہارے بدن سے عجیب سی گرمی محسوس ہوتی ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہر انسان کے بدن میں حرارت ہوتی ہے۔“

”ہوتی ہوگی۔ مجھے تو تمہاری حرارت' تمہاری قربت یاد آتی ہے۔ پہلے تو تم مجھے گلے لگاتی تھیں' پیار کرتی تھیں۔ اب دور کیوں ہٹاتی ہو؟“

”اب تم بڑے ہو گئے ہو۔“

”یہ تو اچھا ہے۔ جب میں تمہارے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں تو ہم برابر لگتے ہیں۔“

”قد آور ہونے کی بات نہ کرو۔ مرد تو اونٹ بنتا جاتا ہے۔ عورت بلی ہی رہتی ہے۔ تم مجھ سے آٹھ برس چھوٹے ہو۔“

”پھر کیوں کہتی ہو کہ میں بڑا ہو گیا ہوں؟“

”یا خدا! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ یہ سمجھنے سے زیادہ محسوس کرنے والی بات ہے۔ کسی بھی لڑکی کو ہاتھ لگاؤ گے' اسے پکڑو گے تو وہ یہی محسوس کرے گی جیسا کہ میں کر رہی ہوں۔“

''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا محسوس کر رہی ہو؟ میں پکڑتا ہوں تو کیا ہوتا ہے؟ پہلے تو تم ایسا نہیں کہتی تھیں؟''

''کہہ تو رہی ہوں' تم بڑے ہو گئے ہو۔ اب مرد لگنے لگے ہو۔''

''وہ تو میں ہوں۔ مرد بن کر پیدا ہوا ہوں۔''

اس کی معصومیت نے اسے الجھا دیا۔ وہ ایسا نہیں سمجھ رہا تھا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔ مگر وہ بھی کیا کرے؟ اس کی قربت گڑبڑا رہی تھی۔ اسے اپنے محبوب حارث کے پاس پہنچا رہی تھی۔

وہ اسے تھپکتے ہوئے بولی۔ ''بس اسی طرح چپ چاپ لیٹے رہو۔ آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ۔''

''نیند نہیں آئے گی۔''

''کیوں نہیں آئے گی؟''

''اس طرح لگنے کے بعد تم اور اچھی لگ رہی ہو۔ میں پیار کروں؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم چاہتے کیا ہو؟''

''تم میرے چہرے کو چومتی تھیں؟''

''یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔''

''اپنے رخسار کو چومنے دو۔''

وہ فوراً ہی اسے دھکا دے کر الگ ہو گئی۔ اسی طرح پہلی بار حارث کو بھی دھکا دیا تھا۔

آہ! تم کہاں ہو حارث...؟ بڑے ضدی تھے۔ مجھ سے مجھ ہی کو چھین لیا کرتے تھے۔

اس نے دیکھا' وہ سایہ اس کے رخسار تک آ گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے حارث کو دیکھنے لگی۔ مگر نہیں... وہ رخسار سے ہو کر پیشانی پر آ گیا۔ جیسے وہ اسے چومتی تھی ویسے ہی وہ معصومیت سے اسے چوم رہا تھا۔

پھر وہ سرکتا ہوا اس کے دھڑکتے ہوئے سینے پر آ گیا۔ وہاں اس نے سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دھڑکنوں کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے۔ بعض حالات میں دھڑکنیں ہوس کی طرف لے جاتی ہیں اور بعض اوقات گمشدہ رشتے کی لے میں دھک دھک کرتی ہیں۔

خودکش حملہ کرنے والی اُمِ حفصہ ان لمحات میں یاقوت کے سینے سے گن گن... گن گن... لوری سنا رہی تھی۔ وہ بہت دور ممتا کے پالنے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

وہ جاگ رہی تھی۔ تاریکی میں آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور وہ آنکھیں حارث کو دیکھ رہی تھیں۔ اس روز اسپتال سے گھر آتے وقت یہ خبر ملی تھی کہ حارث الجمالی کو ابو غریب جیل سے کہیں اور کر دیا گیا ہے۔

یاقوت کا دل گھبرا رہا تھا۔ اسے وہاں سے کیوں منتقل کیا گیا ہے؟ کس جیل میں ٹرانسفر کیا گیا ہے؟

ایک اطلاع کے مطابق اسے سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔

یاقوت کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے محبوب کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ شام تک دی لائن آف اللہ بریگیڈ نے خفیہ طور پر اسے اطلاع دی کہ حارث کو شمالی زون کے شہر سلیمانیہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ سزائے موت پانے والے قیدیوں کو وہیں بھیجا جاتا تھا۔ وہ ڈیتھ ہاؤس یعنی دارالاجل اسی جیل خانے کی چار دیواری میں تھا۔

سینے سے آہیں نکل رہی تھیں... آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

☆☆☆

عراق کے موجودہ سیاست داں امریکا اور اس کے اتحادیوں کی چھتر چھایا میں تھے اور اپنے آقاؤں کی پالیسیوں کے مطابق حکومت کر رہے تھے۔

پالیسی یہ تھی کہ عوام کو بیرونی مداخلت کے خلاف احتجاج کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔

پالیسی یہ تھی کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کو دال روٹی کے مسئلے میں الجھا دیا جائے۔ سانس لینے کے بعد انسان کا سب سے اہم مسئلہ خوراک ہے۔ جب پیٹ نہیں بھرے گا تو لوگ خالی پیٹ حکمرانوں کو گالیاں دیں گے۔ لیکن ان کی غلامانہ سیاست کے خلاف بغاوت نہیں کر سکیں گے۔

پالیسی یہ تھی کہ بیماروں کو دوائیں اور زخمیوں کو مرہم نہ ملے۔ ضرورت سے زیادہ دوائیں فوجی اسپتالوں اور بیرکوں میں ہوتی تھیں۔ ملک کے تمام اسپتالوں میں پانی ملی ہوئی دوائیں ملی تھیں یا ایسی جن کے استعمال کی مقررہ تاریخ ختم ہو جاتی تھی۔ وہ بھی مہنگے داموں اور بری ایکشن کے طور پر مریضوں کو موت سے پہلے مار دیتی تھیں۔

غریب اور محتاج مریض معمولی بیماریوں میں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے تھے اور اپنے معصوم بچوں کو بے بسی سے دم توڑتے ہوئے دیکھتے۔

پالیسی یہ تھی کہ عورتوں' مردوں' بچوں اور بوڑھوں کو خوف و ہراس میں مبتلا رکھا جائے۔ ڈاکے اور قتل و غارت گری میں اضافہ ہوتا رہے۔ ٹارگٹ کلنگ ہو' راہ چلتی عورتوں اور بچوں سے چھینا جھپٹی ہو، اغوا برائے تاوان ہو اور پولیس کبھی موقع واردات پر نہ پہنچے۔

...اور یہ کہ کٹھ پتلی حکمران اپنے مفادات حاصل کرنے میں مست رہیں۔ پولیس کا محکمہ اور قانون کے محافظ وردی میں رہ کر قانون کی دھجیاں اڑائیں اور چھوٹے بڑے مجرموں کو

واردات کرنے کی چھوٹ دیتے رہیں۔

یاقوت کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ پڑوس میں وسیم کے ساتھ اس کے مکان میں تھی اور اس کے اپنے مکان میں واردات کرنے والے گھس آئے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ چہرے پر ماسک اور ہاتھوں میں گنز تھیں۔ انہوں نے آتے ہی دھمکی دی۔ ''خبردار! شور مچاؤ گے تو موت ہمیشہ کے لیے خاموش کر دے گی۔ جو بھی نقد دینار اور ڈالرز ہیں، ہمارے حوالے کر دو۔''

یاقوت کے باپ نے کہا۔ ''ہماری ایک ہی بیٹی کمانے والی ہے۔ ابھی اس کی تنخواہ نہیں ملی۔ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی ایک نے گن کے دستے سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ وہ بوڑھا مار کھا کر فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ مارنے والے نے کہا۔ ''جھوٹ بولے گا تو کتے کی موت مرے گا۔ تیری بیٹی آج شام آرمی اسپتال سے آئی ہے۔ ماہانہ تنخواہ اور اوور ٹائم کے پانچ ہزار ڈالرز لائی ہے۔''

دوسرے نے ایک کمرے میں جاتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی وہ رقم نکال کر لاتا ہوں۔''

دوسرے کمرے میں یاقوت کی بڑی بہن سلیمہ اپنی ماں کے ساتھ سہمی بیٹھی تھی۔ وہاں دو گن بردار آئے۔ ایک نے ان ماں بیٹی سے کہا۔ ''اے اٹھو! یہ الماری کھولو۔''

سلیمہ دیکھ چکی تھی کہ اس کے باپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہے، وہ چپ چاپ الماری کھولنے لگی۔ ایک نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہائے! کیا قیامت ہے؟''

دوسرے نے پیچھے سے آ کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ وہ سمٹ کر بولی۔ ''مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ خدا سے ڈرو۔ میں سہاگن ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''پھر تو کافی تجربہ ہو گا۔ ہمیں بہت خوش کرو گی۔''

دوسرے نے کہا۔ ''پہلے مال وصول کرنے دو۔ اسے الماری کھولنے دو۔''

سلیمہ نے آگے بڑھ کر چابی نکالی، الماری کے ایک پٹ کو کھولا۔ گن بردار نے اسے دھکا دے کر دور ہٹایا پھر دونوں پٹ کھول کر ایک جگہ ملبوسات کے نیچے سے ڈالرز کی ایک پتلی سی گڈی نکالی۔ وہ یاقوت کی مہینے بھر کی تنخواہ تھی۔

سلیمہ حیرانی سے سوچ رہی تھی کہ ڈاکا ڈالنے والا تلاشی لیے بغیر سیدھا ان نوٹوں تک کیسے پہنچ گیا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ وہ رقم کپڑوں کی تہ میں چھپا کر رکھی گئی ہے؟

اس نے سلیمہ سے چابیاں چھین کر ایک دراز کو کھولا۔ وہاں سونے کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ وہ تمام زیور نقد رقم کے ساتھ بیگ میں پہنچ گئے۔ ڈاکا ڈالنے والوں نے پھر کسی سامان کی تلاشی نہیں لی۔ الماری میں چار درازیں تھیں۔ انہوں نے کسی کو کھول کر نہیں دیکھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ اس گھر میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

البتہ لوٹنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں سلیمہ کا لباس پھاڑنے لگے۔ وہ رونے لگی۔ اب نقدی اور زیورات کے ساتھ آبرو کا مال و متاع بھی جانے والا تھا۔

اس کی ماں گڑگڑاتے ہوئے ان کے پاؤں پکڑنے لگی۔ انہوں نے اسے ٹھوکروں میں اڑا دیا۔

سلیمہ کا شوہر منعم ایک طرف سہا ہوا اکڑوں بیٹھا تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر التجائیں کرنے لگا۔ ایک نے اس کے شانے پر لات ماری۔ وہ فرش پر الٹ کر وہیں پڑا رہ گیا۔ اس نے وہاں سے اٹھنے کی غلطی نہیں کی کیونکہ ایک نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔

کمرے کے باہر بوڑھا باپ زخمی پڑا تھا۔ منہ اور ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔ کمرے کے اندر سے بیٹی کی آہیں' کراہیں اور فریادیں سنائی دے رہی تھیں۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ بیٹی کے ساتھ کیسا شرمناک سلوک کیا جا رہا ہے؟ بے شرمی کی انتہا یہ تھی کہ ایک ماں ... اور شوہر کے سامنے حیوانیت کا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ ابھی وہاں دو تھے' تیسرا بھی ادھر جانے والا تھا۔

اس نے درمیانی دیوار کے چھوٹے سے دروازے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تیری دوسری بیٹی ادھر والے مکان میں ہے۔ ایک لونڈے کے ساتھ سو رہی ہے۔''

بوڑھے کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے، وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ''انکار کیا کرتا ہے؟ وہ سالی اِدھر آ کر ہمارے ساتھ بھی منہ کالا کر سکتی ہے۔''

اس نے آگے بڑھ کے بندوق کے دستے سے دروازے پر دستک دی۔ یاقوت بستر پر پڑی سوچ میں گم تھی۔ کمرے کے باہر آنگن کے پار درمیانی دروازے پر دھماکے کے انداز میں دستک ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گئی۔

اس نے آنگن میں آ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ چھٹی حس نے کہا' دستک نارمل نہیں ہے۔ جارحانہ آواز آ رہی ہے۔

وہ سوچتی ہوئی آگے بڑھی۔ اسی وقت پھر دروازے پر دھماکے سے ہوئے۔ وہ سہم کر رک گئی۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

اُدھر باپ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنی تمام توانائیوں کو سمیٹ کر کسی طرح حلق سے آواز نکالی اور بڑی مشکل سے کہا۔ ''دروازہ نہ کھولنا... خطرہ ہے۔''

دروازہ کھلوانے والا جھنجلا گیا۔ اس نے بندوق کے دستے سے زوردار ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہوجا خبیث...!''

وہ ایک ذرا سا پھڑ پھڑا کر ہمیشہ کے لیے چپ ہوگیا۔ یاقوت وہاں سے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وسیم کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''اٹھو... آنکھیں کھولو! خطرہ ہے۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا سسٹر...؟''

وہ اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے مکان میں دہشت گرد گھس آئے ہیں۔ دروازہ توڑ کر ادھر بھی آسکتے ہیں۔ ہم کسی دوسری جگہ جا کر پناہ لیں گے۔''

[illegible] آف اللہ بریگیڈ کے ایک مجاہد سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے تڑتڑا فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجاہد نے پوچھا۔ ''ہیلو یاقوت! اتنی رات کو کال کررہی ہو... خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے۔ میرے گھر میں دہشت گرد گھس آئے ہیں۔ میں پڑوس والے گھر سے بول رہی ہوں۔ پلیز! میری مدد کے لیے آؤ۔''

''ہم یہاں کاؤنٹر فائرنگ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک طرف اتحادی فوجی چھڑکوں میں ہیں۔ دوسری طرف غلام عراقی سپاہی گولیاں چلا رہے ہیں۔ ہم یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ ہمارے چار مجاہدین مارے جاچکے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''یہ سن کر افسوس ہورہا ہے۔ ٹھیک ہے، میری فکر نہ کرو۔ میں یہاں سے کسی دوسری گلی میں جارہی ہوں۔''

وسیم بستر سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ حیرانی سے فون پر ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی کمرے سے نکل کر مکان کے پچھلے حصے کی دیوار کے پاس آئی۔ اُدھر درمیانی دروازے پر دھماکے ہورہے تھے۔ اُسے توڑنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔

واردات کرنے والوں کو اس بات کا ذرا سا بھی خوف نہیں تھا کہ شور سن کر محلے والے آجائیں گے یا پولیس کو کال کریں گے۔ انہیں یہ یقین تھا کہ راتوں کو چاہے قیامت آجائے، کوئی اپنے گھر سے نہیں نکلے گا۔ لٹنے اور مرنے والوں کے ساتھ صبح ہمدردی کی جاتی تھی۔

اور پولیس تو اپنے گھر کی تھی۔ اسی کی سرپرستی میں کھل کھلا کر ڈاکے، قتل اور اغوا کی وارداتیں ہوتی تھیں۔

یاقوت نے اکڑوں بیٹھ کر وسیم سے کہا۔ ''میرے کاندھوں پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھو اور دوسری طرف کود جاؤ۔''

وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔''

''انکار نہ کرو۔ میں تمہارے پیچھے آرہی ہوں۔''

''تم دیوار پر کیسے چڑھو گی؟''

''میں اندر سے کرسی لے آؤں گی۔ بحث نہ کرو۔ وہ دروازہ توڑ رہے ہیں۔''

''میں بدتمیزی نہیں کروں گا۔ تمہارے اوپر پاؤں نہیں رکھوں گا۔''

وہ دوڑتا ہوا قریبی کمرے میں گیا۔ وہاں سے ایک کرسی اٹھا کر لے آیا پھر بولا۔ ''پہلے تم جاؤ۔''

وہ بولی۔ ''نہیں۔ پہلے تم جاؤ۔ میری بات مانو۔ دیر نہ کرو۔''

''نہیں سسٹر! میرا ضمیر گوارا نہیں کرے گا۔ پہلے تم یہاں سے نکلو۔''

یاقوت نے جھنجلا کر اسے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔ ''ضد کرو گے تو یہاں سے جا کر کہیں مر جاؤں گی۔ پھر کبھی میری صورت نہیں دیکھ سکو گے۔''

وہ تڑپ کر آگے بڑھا۔ اس سے لپٹ کر بولا۔ ''میں تمہاری صورت دیکھوں گا، دن رات دیکھوں گا۔ ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ اُدھر جا کر تمہارا انتظار کروں گا۔''

''نہیں۔ آگے جا کر کسی گھر کا دروازہ کھلواؤ۔ میں وہاں آجاؤں گی۔ اب چھوڑو بھی... کب تک لپٹے رہو گے؟''

وہ الگ ہوتے ہی اس کے رخسار کو چوم کر کرسی پر آگیا پھر وہاں سے دیوار پر چڑھ کر بولا۔ ''تم بہت اچھی لگتی ہو۔ جلدی آؤ۔ میں کسی گھر کا دروازہ کھلواتا ہوں۔''

وہ دوسری طرف کود کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ دہشت گردوں کا خوف طاری تھا۔ اس کے باوجود وسیم کا لڑکپن اور پیار کہہ رہا تھا، ہماری زندگی میں صرف دہشت گرد نہیں ہیں، پیار کی جادوگری بھی ہے جو جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔

وہ بھی کرسی پر چڑھ کر دیوار پر آگئی۔ ایسے ہی وقت وہ درمیانی دروازہ ٹوٹ گیا۔ ایک نے کہا۔ ''وہ دیکھو! وہ فرار ہورہی ہے۔''

وہ دوسری طرف کود گئی۔ اس نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا۔ پتا نہیں وسیم کس سمت گیا تھا؟ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ ایک سمت میں بھاگتی چلی گئی۔

آگے کسی قریبی مکان کا دروازہ پیٹ کر اسے کھلوانے میں دیر لگتی۔ پیچھا کرنے والے آکر اسے دبوچ لیتے۔ وہ دور بھاگتی چلی گئی۔ پلٹ کر دیکھتی بھی رہی۔ پیچھے گلی ویران تھی۔ شاید انہوں نے اسے پکڑنے کا خیال ترک کردیا تھا۔ نقدی اور زیورات کے ساتھ منہ کالا کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ ان کی تسلی ہوگئی تھی۔

یوں یاقوت کی جان چھوٹ گئی۔ آگے جا کر اسے ایک گھر میں پناہ مل گئی۔ وہاں اس نے پناہ دینے والوں کو بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اور نہ جانے وہ دہشت گرد اس کے گھر والوں کے ساتھ کیسا سلوک کررہے ہوں گے؟ اب وہ صبح ہی وہاں جا کر معلوم کرسکتے تھے۔ فی الوقت وسیم کی فکر تھی... وہ کہاں ہوگا؟

وسیم دیوار سے کود کر دوسری گلی میں آیا تھا۔ پھر اس نے ایک طرف دوڑتے ہوئے دیکھا، آگے مکانات نہیں تھے۔ دکانیں بند پڑی تھیں۔ گلی کے موڑ پر دوسری تیسری گلیوں میں مکانات تھے۔ اس نے ادھر دوڑ لگائی پھر ایک دم سے ٹھٹک گیا۔ گشتی پولیس کی وین اس کے سامنے آکر ایک زوردار بریک کے ساتھ رک گئی تھی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انسپکٹر نے گالی دیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا مرنے کے لیے ہماری گاڑی کے نیچے آنا چاہتا ہے؟''

پھر اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ''ہیڈ لائٹس آن کرو۔ دیکھو! یہ کون ہے؟''

وہ پولیس والے کسی وجہ سے لائٹس بجھا کر گشت کررہے تھے۔ روشنی ہوتے ہی وسیم دکھائی دیا۔ ایک سپاہی نے کہا۔ ''سر! بہت ہی خوبصورت چھوکرا ہے۔''

انسپکٹر نے اسے دور سے مگر غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہے تو؟''

''میرا نام وسیم مصطفیٰ ولد غلام مصطفیٰ ہے۔ اُدھر ساتویں گلی میں رہتا ہوں۔''

انسپکٹر نے کہا۔ ''او... اچھا ساتویں گلی میں... غلام مصطفیٰ یعنی وہی غلام جس کے بیٹے کا نام سراج مصطفیٰ تھا اور جو کیمیکل... حرام موت مرچکا ہے؟''

وسیم نے کہا۔ ''حرام موت نہ کہو۔ میرے بھائی نے شہادت کا درجہ پایا ہے۔''

وہ سب ہنسنے لگے۔ ''شہادت کا درجہ...؟ ہاہاہا... یہ لوگ کتوں کی موت مرتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے انہیں شہید ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں۔ اٹھالو اسے...''

دو سپاہیوں نے اسے اٹھا کر وین کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ انسپکٹر نے فون کے ذریعے مطلوبہ شخص کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو ابو ولاد! ایک سودا ہے۔ تھانے آؤ اور ڈن کرو۔''

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

رابطہ منقطع ہوگیا۔ وسیم پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''مجھے کہاں لے جارہے ہو؟ میں اپنا محلہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر واپس نہ گیا تو میری سسٹر پریشان ہوجائیں گی۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔''

وہ بول رہا تھا مگر سب بہرے تھے۔ کوئی نہیں سن رہا تھا۔ تھانے پہنچ کر اسے حوالات میں ڈال دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ابو ولاد اپنے مسلح گارڈز کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس نے حوالات میں وسیم کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے...؟ حسن مجسم ہے۔''

اس نے وسیم کو اچھی طرح سے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر انسپکٹر کے پاس جا کر باتیں کرنے لگا۔ وسیم آہنی سلاخوں کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں یوں باتیں کررہے تھے جیسے بحث کررہے ہوں۔ ان کے سرہاں اور نہ کے انداز میں ہل رہے تھے۔

پھر ابو ولاد نے نوٹوں کی ایک گڈی انسپکٹر کے سامنے رکھ دی۔ اس نے وہ گڈی اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ ابو ولاد نے وسیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے گارڈز سے کہا۔ ''اسے لے چلو۔''

گارڈز نے اسے حوالات سے باہر نکالا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ ''میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔ مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لیے مجھے جانے دو۔''

ایک گارڈ نے ریوالور کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی پھر پوچھا۔ ''جینا چاہتا ہے یا مرنا...؟''

وسیم نے سہم کر دیکھا۔ ابو ولاد نے کہا۔ ''زندہ رہے گا تو اپنی سسٹر اور گھر والوں کے پاس جاسکے گا۔ ابھی جہاں جائے گا، وہاں عیش کرے گا۔ بہت سارے نوٹ کمائے گا۔ کمانے والوں سے سب ہی خوش رہتے ہیں۔ تیری سسٹر بھی خوش ہوجائے گی۔''

اس کے منہ سے ریوالور کی نال نکالی گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یہ آس دلائی جارہی تھی کہ وہ بعد میں یاقوت کے پاس جاسکے گا۔

موت کی دہشت بھی تھی اور وہ بہن تک پہنچنے کے لیے زندہ بھی رہنا چاہتا تھا۔ وہ گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا ایک گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ اس گاڑی میں تقریباً ایک گھنٹے تک سفر جاری رہا۔ پھر وہ ایک کھنڈر جیسی عمارت کے سامنے آکر رک گئے۔ وہ شہر کا جنوبی علاقہ تھا۔ دو گارڈز اسے عمارت کے اندر لے آئے۔

وہاں ایک بڑے سے ہال میں تقریباً پچیس لڑکے تھے۔ وہ سب چھ برس سے لے کر اٹھارہ برس کے تھے۔ تمام رات

محنت کرنے کے بعد وہ سب فرش پر بے سدھ پڑے تھے۔ کوئی سو رہا تھا، کوئی جاگ رہا تھا۔

وہ جگہ وسیم کو عجیب سی لگ رہی تھی۔ اگرچہ وسیع و عریض ہال تھا لیکن اسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے اس کے بازو کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔ مجھے جانے دو۔“

دوسرے نے اس کی گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں جائے گا؟ یہاں آنے والے ہماری مرضی سے جیتے اور مرتے ہیں۔“

وسیم نے جواباً اسے ایک الٹا ہاتھ رسید کر دیا اور پھر دوسرے آدمی سے اپنا بازو چھڑانے لگا۔ وہ دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہاں ایک بوڑھا نگراں تھا۔ وہ چھڑی ٹیکتا ہوا آیا۔ ان دونوں کو چھڑی سے مارتے ہوئے بولا۔ ”اس لڑکے پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ آقا نے ابھی فون پر کہا ہے' یہ اسپیشل ہے۔ اس کے منہ پر، اس کے بدن پر کوئی نشان نہیں لگنا چاہیے۔ اسے ٹریننگ کے لیے بھیجا جائے گا۔“

وہ دونوں اس سے ذرا دور ہو گئے۔ ایک نے ٹی ٹی سے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”ہم تجھے ہاتھ نہیں لگائیں گے لیکن یہاں سے بھاگنے کی بات کرے گا تو گولی مار دیں گے۔“

دوسرے شخص نے اس بوڑھے سے کہا۔ ”اسے سمجھا دو' باہر نکلے گا تو مارا جائے گا۔“

وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ بوڑھے نے وسیم کے سینے پر چھڑی کی نوک رکھی۔ جیسے تنبیہ کے انداز میں انگلی رکھ رہا ہو پھر اس سے کہا۔ ”سن لیا یہ کیا کہہ رہے تھے۔ باہر یقیناً موت ہے، یہ بات تمام لڑکے جانتے ہیں۔“

اس نے چھڑی کا رخ لڑکوں کی طرف کیا۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”ہاں، باہر موت ہے۔“

وہ پریشان ہو کر کبھی ان لڑکوں کو، کبھی بوڑھے کو اور کبھی باہر کھلنے والے دروازے کو دیکھ رہا تھا جو بند ہو چکا تھا۔ بوڑھے نے کہا۔ ”تو بہت حسین ہے۔ آقا نے کہا ہے' تجھے کانچ کی طرح سنبھال کر رکھنا ہے۔ ذرا سی ٹھیس نہیں لگانا ہے۔ ویسے تو یہاں نہیں رہے گا۔“

وسیم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”کسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔ ایک خاص ٹریننگ سینٹر میں بڑی اچھی تربیت حاصل کرے گا۔ جا... اُدھر جا کر بیٹھ جا۔“

وہ الجھا ہوا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کہاں آ گیا ہے؟ وہ ہال میں لڑکوں کے درمیان آ کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہاں کوئی سو رہا تھا' کوئی جاگ رہا تھا۔ وہ تین لڑکوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ”میرا نام وسیم مصطفیٰ ہے۔ میں شہید اعظم سراج مصطفیٰ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ تم نے میرے بھائی کا نام سنا ہے؟“

وہ تینوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انہوں نے انکار میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ”ہم نے صدام حسین کا اور امریکا کے ایک بش کا نام سنا ہے۔“

وسیم کو افسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”جب مجاہدین امریکا کو یہاں سے بھگا دیں گے' ہمارا وطن آزاد ہو جائے گا' تب شہیدوں کا نام بچے بچے کی زبان پر ہو گا۔“

ان لڑکوں کے چہروں سے بہتری کی کوئی امید' آزادی کی کوئی خواہش ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ وسیم نے پوچھا۔ ”تمہیں یہاں قیدی بنا کر کیوں رکھا گیا ہے؟ تم سے کیا کام لیا جاتا ہے؟“

ایک سولہ برس کے لڑکے نے کہا۔ ”ہم سب نائٹ ڈیوٹی کرتے ہیں۔ ابھی اپنی اپنی ڈیوٹی سے واپس آئے ہیں۔“

ایک لڑکے نے کہا۔ ”میرا نام فراز ہے۔ ہم سب طوائف ہیں۔“

وسیم کو ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو؟ طوائف، عورت ہوتی ہے، مرد نہیں ہوتا۔“

”مرد بھی ہوتا ہے۔ جس طرح ایک طوائف کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی مجبور کیا جاتا ہے۔“

تب وسیم کے دماغ نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ حیرانی سے سر گھما کر ان دونوں لڑکوں کو دیکھنے لگا جو بے سدھ سو رہے تھے۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوتا؟ یہ سب لڑکے آ کر سو گئے ہیں، تم کیوں جاگ رہے ہو؟“

”کیا کریں' کبھی کبھی بہت تھکن ہونے کے باوجود نیند نہیں آتی۔“

ایک بارہ برس کے لڑکے نے اپنا سر تھام کر کہا۔ ”خدایا! سر دکھ رہا ہے۔“

ایک نے اپنی کمر کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا۔ ”وہ لوگ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں نہ مانو تو لاتیں مارتے ہیں۔ ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ... کہ...“

وہ وسیم کو دیکھ کر بولا۔ ”میں کیا بتاؤں اب آ گئے ہو... تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا۔“

وہ پریشانی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گا۔“

”زندہ رہنا ہے تو یہاں رہنا ہی ہو گا۔“

”کیا فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے؟“

"ہے... یہ بعد میں آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم آزاد ہیں جہاں چاہیں جاسکتے ہیں مگر نہیں جاتے۔"
وسیم نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیوں نہیں جاتے؟"
اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میں اپنے خاندان میں واپس نہیں جاسکتا۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکتا۔ انہوں نے میری شرمناک تصویریں اتاری ہیں۔ میں دھندے سے انکار کرتا ہوں تو وہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ تمام تصویریں میری فیملی میں پہنچادیں گے۔"
وہ پھر ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "میرا باپ' میرے بھائی بہت غیرت مند اور غصے والے ہیں۔ مجھے گولی ماردیں گے۔"
وسیم نے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تمہارے بزرگوں کو سمجھنا چاہیے کہ تمہیں یہاں کس طرح مجبور کیا گیا ہے؟"
"ہاں' مگر غیرت کے جوش میں کوئی نہیں سمجھتا۔"
ایک لڑکے نے کہا۔ "میرے بزرگ میری مجبوریاں سمجھتے ہیں لیکن وہ ابوولاد کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔"
وسیم نے پوچھا۔ "یہ ابوولاد کون ہے؟"
وہ بوڑھا دور بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر چھڑی ٹیکتا ہوا آیا پھر بولا۔ "وہ ہمارا آقا ہے۔ بہت پہنچا ہوا ہے۔ کوئی اس کی گردن تک نہیں پہنچ پاتا۔ ابھی اسی نے تمہیں تھانے والوں سے نجات دلائی ہے۔ وہ تمہارے جیسے بے شمار بچوں کا باپ ہے اس لیے ابوولاد کہلاتا ہے۔"
پھر وہ چھڑی نچاتے ہوئے بولا۔ "چلو اٹھو یہاں سے اور اپنی اپنی جگہ جاکر سو جاؤ۔ اب کسی کی باتوں کی آوازیں سنائی نہ دیں۔"
وہ چھڑی ٹیکتا ہوا لکڑی کے ایک تخت پر جاکر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکے ادھر ادھر جاکر لیٹ گئے۔ وسیم بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی پچھلی رات سے جاگ رہا تھا۔ لیٹنے کے بعد شاید نیند آجاتی مگر ایک یاقوت بار بار یاد آرہی تھی۔ پوچھ رہی تھی۔ "کہاں کھوگئے ہو؟"
پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ اس سے سامنا ہوگا تو کیا کہے گا کہ کیسی جگہ ہے؟ ایسی جگہ جہاں مرد اپنی آبرو لٹاتے ہیں۔
پورے عراق میں یہ شرمناک دھندا جاری تھا۔ اناج کی کمی مہنگائی' بے روزگاری' غربت اور محتاجی کے باعث لڑکے راضی خوشی اس دھندے میں آرہے تھے۔ اس سے ان کو اور گھر والوں کو تین وقت کی روٹیاں مل رہی تھیں۔
یہ کام نچلی سطح پر بھی تھا اور اعلیٰ پیمانے پر بھی جاری تھا۔ امیر کبیر شوقین حضرات بڑے بڑے مہنگے ہوٹلوں کے سوئمنگ پول میں غوطے لگاتے تھے۔ تیرتے تھے' شراب پیتے تھے اور نو خیز لڑکوں سے کھیلتے تھے۔
بڑے بڑے عالی شان محلات کے حرم سراؤں میں صرف کنیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ حسین لڑکوں کا بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ اس قدر وسیع پیمانے پر ہونے والا دھندا قانون کی ڈھیل اور پولیس کے تعاون کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔
اور بھلا کیوں نہ ہوتا؟ اتحادی فوج کے جوانوں کی پہلی ترجیح کم سن لڑکے ہی تھے۔ آخر وہ فوجی بھی انسان تھے۔ ان کی تہذیب میں سیکس کا معاملہ ایسا تھا' جہاں شرم و حیا کا اور اخلاقیات کا گزر ہوتا ہی نہیں تھا۔
یہ عبرت کی جا ہے کہ جس ملک میں بھی امریکا کے کٹھ پتلی حکمران ہیں وہاں مہنگائی' بے روزگاری' اسٹریٹ فائرنگ' ٹارگٹ کلنگ' جرم و تشدد' قانون کی موت اور ناانصافی لازمی ہوتی ہے۔ ایک طرف غربت اور مہنگے اناج کا حصول' دوسری طرف موت کی دہشت مجبور کرتی ہے کہ زندگی اور بچوں کی فکر کرو۔ حکمرانوں کو بے لگام رہنے دو۔

☆☆☆

یاقوت کو محلے کے ایک گھر میں پناہ مل گئی تھی۔ پناہ دینے والوں نے اس سے ہمدردی کی تھی لیکن وہ اور محلے والے اتنی رات کو اس کے گھر جاکر واردات کرنے والوں کا محاسبہ نہیں کرسکتے تھے۔ اس شہر میں کئی مسلح جرائم پیشہ گروہ تھے۔ کوئی انہیں للکارنے اور ان سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ پولیس والوں سے سالے بہنوئی کا رشتہ رکھتے تھے۔ یعنی ساری دنیا ایک طرف جورو کا بھائی ایک طرف...
وہ ایک طرف قانون سے بالاتر رہتے تھے، دوسری طرف لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ ڈکیتی' قتل اور اغوا کی واردات سے انہیں بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ صبح محلے والوں کے ساتھ اپنے گھر میں آئی تو وہاں پچھلی رات قیامت گزر چکی تھی۔
صحن میں باپ کی لاش پڑی تھی۔ ایک کمرے کے بند دروازے کے پاس اس گھر کا داماد عبدالمنعم سر جھکائے بیٹھا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ماں رو رہی تھی۔ یاقوت باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔
محلے والوں نے کمرے کا دروازہ پیٹتے ہوئے یاقوت کی ماں سے پوچھا۔ "لاش یہاں پڑی ہے۔ تم وہاں رو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟ دروازہ کھولو۔"
تھوڑی دیر بعد بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔
"میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ کوئی مرد ادھر نہ آئے۔ آپ لوگ صحن میں چلے جائیں۔"
مرد وہاں سے ہٹ گئے۔ دروازہ کھل گیا۔ عورتوں نے وہاں جاکر دیکھا تو ہائے ہائے کرنے لگیں۔ سلیمہ فرش پر پڑی تھی۔ لباس تار تار ہوچکا تھا۔ حالت دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ عزت کی دھجیاں بکھر چکی ہیں۔ ظالموں نے بے دردی کی انتہا کردی تھی۔ وہ نیم مردہ سی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگتا تھا مرچکی ہے۔
وہ ایسی حالت میں تھی کہ عورتوں سے کچھ کہنا نہیں پڑا۔ وہ سب سمجھ گئیں کہ اجتماعی زیادتی کرنے والے کچھ زیادہ ہی درندگی دکھا کر گئے ہیں۔
یاقوت نے وہاں آکر بہن کی حالت دیکھی۔ پھر اس پر ایک چادر ڈال کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ سلیمہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر بہن کو دیکھا۔ وہ ہولے ہولے جھٹکے کھارہی تھی۔ مشکل سے سانسیں لے رہی تھی۔ بولنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ پھر بھی اپنی قوت کو مجتمع کرتے ہوئے بولی۔ "منن... عم... وار... واردات..."
وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا دم نکل گیا۔ بہن نے آخری وقت' آخری سانسوں میں اپنے شوہر منعم کو یاد کیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر سر جھکائے رو رہا تھا۔ شاید اس لیے رو رہا تھا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی شریکِ حیات کی آبرو لٹتے دیکھتا رہا تھا۔
دن کے اجالے میں محلے کے سیکڑوں افراد دو لاشوں کی تجہیز و تدفین کے لیے آگئے تھے۔ پولیس نے رسمی طور پر پوچھ گچھ کی۔ لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرایا پھر انہیں تدفین کی اجازت دے دی۔
علاقے میں ایسی بھیانک وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کچھ روز تک بڑی گرما گرمی سے ان کا چرچا ہوتا پھر ایسی خاموشی چھا جاتی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس واردات پر بھی ایسی ہی خاک پڑنے والی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شام کو یاقوت کی ماں نے بین کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا پھر بیٹی سے کہا۔ "دروازہ مقفل تھا۔ وہ ڈاکو اندر کیسے آئے؟"
یاقوت نے اُدھر دیکھا پھر سوچا' دروازہ باہر سے کھلوایا نہیں گیا۔ اسے توڑا نہیں گیا۔ مکان میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے بہنوئی سے پوچھا۔ "وہ لوگ اندر کیسے آئے ہوں گے؟"
وہ حیرانی سے بولا۔ "میں نے غور نہیں کیا۔ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ اس وقت عزت اور جان و مال کی فکر تھی۔ آنے والے آہی گئے تھے اس لیے دروازے کی طرف دھیان نہیں گیا۔"
ماں نے وہاں سے اٹھ کر کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "منعم! یہاں آؤ۔"
وہ اس کے پیچھے گیا۔ یاقوت نے بھی کمرے میں آکر پوچھا۔ "کیا بات ہے ماں...!"
ماں نے الماری کھولتے ہوئے کہا۔ "ڈاکا ڈالنے والے گھروں میں گھستے ہی مال و زر تلاش کرتے ہیں مگر انہوں نے تلاشی نہیں لی۔ جیسے ہی سلیمہ نے الماری کھولی' ایک ڈاکو نے ان کپڑوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر یاقوت کی مہینے بھر کی تنخواہ نکال لی۔"
یاقوت نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا واقعی انہوں نے تلاشی نہیں لی اور سیدھے نقد رقم تک پہنچ گئے؟"
ماں نے کہا۔ "ہاں، انہیں کیسے معلوم ہوا کہ رقم ٹھیک اسی جگہ رکھی گئی ہے؟"
ماں بیٹی نے منعم کو دیکھا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مجھے کیا دیکھ رہی ہو؟ میں تو خود حیران ہورہا ہوں۔"
ماں نے یاقوت سے کہا۔ "پھر جانتی ہو کیا ہوا؟"
اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"
وہ بولی۔ "اس ڈاکو نے سلیمہ سے چابیاں چھین کر اس نچلی دراز کو کھولا جبکہ اسے اوپر والی دراز کھول کر پہلے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ سونے کے زیورات اسی ایک دراز میں رکھے ہوئے ہیں۔"
یاقوت نے کہا۔ "یا خدا! انہیں واردات سے پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ ان کی مطلوبہ چیزیں کہاں رکھی ہوئی ہیں؟"
ماں نے کہا۔ "ہاں۔ اب سوچو! دروازہ مقفل تھا... اسے اندر سے کسی نے کھولا تھا' تب ہی وہ آسانی سے یہاں گھس آئے تھے۔"
وہ بولی۔ "تعجب ہے ماں! دروازہ اندر سے کون کھولے گا؟"
وہ ماں بیٹی بول رہی تھیں اور منعم کو تک رہی تھیں۔ وہ بولا۔ "میں رات دس بجے ہی سو گیا تھا۔ تمہارے والد جاگ رہے تھے۔"
ماں نے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ بھی سو گئے تھے۔ کل شام کو تم الماری کے پاس گئے تھے۔ تم نے سلیمہ کو کپڑوں کے نیچے رقم رکھتے ہوئے دیکھا تھا اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ زیورات نچلی دراز میں رکھے جاتے ہیں۔"
وہ گھبرا گیا مگر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں نے یہ واردات کرائی ہے؟ کیا میں نے ان کے لیے دروازہ کھولا تھا؟"
"اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دو۔ تم نے نہیں تو کس

نے کھولا تھا؟ ڈاکوؤں کو کیسے معلوم ہوا کہ یاقوت تنخواہ اور اوور ٹائم کے پانچ ہزار ڈالرز لے کر آئی ہے؟ انہیں الماری میں یہاں چھپا کر رکھا گیا ہے؟ یہ تو صرف ہم گھر والے ہی جانتے ہیں۔ ہم نے باہر محلے میں کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔"

"تو کیا میں نے بتائی ہے؟"

"ہاں، تم ہڈحرام ہو۔ میری بیٹی کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔ کبھی کوئی الٹا سیدھا دھندا کر کے کچھ کماتے ہو تو نشہ کرنے لگتے ہو۔"

یاقوت نے کہا۔ "منعم! تم نے پچھلے ہفتے ماں اور سلیمہ سے جھگڑا کیا تھا اور کہا تھا کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ گے مگر جانے سے پہلے ہمیں تباہ کر دو گے۔"

وہ اپنا سینہ ٹھونک کر بولا۔ "ہاں، کہا تھا... جاؤ... باہر جا کر چیخو چلاؤ کہ میں نے یہاں ڈاکا ڈالا ہے۔ اپنی بیوی اور سسر کو قتل کیا ہے۔ دیکھتا ہوں، میرا کون کیا بگاڑ لے گا؟"

یاقوت اسے دیکھ رہی تھی، سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "سلیمہ آخری وقت بول نہیں پا رہی تھی مگر اس نے دم توڑتے وقت تمہارا نام لیا تھا۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا وہ مرتے ہوئے بتا کر گئی ہے کہ میں نے یہاں واردات کرائی ہے؟"

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "ہاں، اس نے کہا تھا منعم... پھر اس نے کہا تھا، واردات... اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی۔ بے شک وہ یہی کہنا چاہتی تھی کہ واردات تم نے کرائی ہے۔"

وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ "ہاں کرائی ہے، باہر جاؤ... فریاد کرو۔ دیکھتا ہوں، کون تمہارا ساتھ دینے آتا ہے؟ جو آئے گا، اس کے گھر میں بھی واردات کراؤں گا۔ میں جس گھر کی مخبری کرتا ہوں اور ڈاکا ڈالنے والوں کو وہاں سے مال ملتا ہے تو وہ مجھے دس فیصد کمیشن دیتے ہیں۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا... نہ میں ڈاکا ڈالتا ہوں، نہ کوئی خطرہ مول لیتا ہوں۔ بیٹھے بیٹھے مال کماتا ہوں۔"

وہ فاتحانہ انداز میں وہاں سے جانے لگا۔ دونوں ماں بیٹی نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ بیرونی دروازے سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ کیسی بے بسی تھی؟ گھر داماد بن کر رہنے والا شخص اپنے جرم کا اعتراف کر رہا تھا اور وہ کسی ثبوت کے بغیر اسے قانون کے شکنجے میں نہیں لا سکتی تھیں۔ یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ اس ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔

یاقوت نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ "میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ یہ میرے باپ کا، میری بہن کا قاتل ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اس نے دوسرے کمرے میں آ کر دی لائن آف اللہ بریگیڈ کے ایک مجاہد سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ اس کے گھر میں کس طرح واردات کی گئی ہے۔ اس کے باپ کو اور بہن کو قتل کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ کرانے والا اس کا بہنوئی عبدالمنعم ہے۔

پھر اس نے کہا۔ "ان ظالموں اور قاتلوں کو سزا نہیں ملے گی تو میں اندر سے ٹوٹ جاؤں گی۔ صدمے سے مر جاؤں گی۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "صدمہ برداشت کرو۔ ہم منعم کو جانتے ہیں۔ اب وہ زمین پر نظر نہیں آئے گا۔ تمہاری بہن اور باپ کے قاتل اپنے انجام کو پہنچیں گے۔"

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ جن کے لیے وہ کام کر رہی ہے، وہ اس کے کام آئیں گے۔ قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس اطمینان کے باوجود بے اطمینانی تھی۔ وسیم کی فکر ستا رہی تھی، وہ پچھلی رات سے لاپتا تھا۔ اس کی گمشدگی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بخیریت نہیں ہے۔ پتا نہیں کہاں ہے؟ واپس کیوں نہیں آ رہا ہے؟

☆☆☆

اُسے شام سے پہلے دوسری عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ایک بڑے سے کمرے میں چار کم عمر لڑکے تھے۔ اس طرح وہ بھی بہت خوبرو تھے لیکن ان میں لڑکیوں جیسی نزاکت نہیں تھی۔ وہ ناز و انداز نہیں جانتے تھے۔ انہیں بڑے نخروں سے ہاتھ نچا کر، آنکھیں مٹکا کر باتیں کرنا نہیں آتا تھا۔ یہ کمی پوری کرنے کے لیے انہیں وہاں لا کر باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔

ایسے تربیت یافتہ لڑکے مہنگے ہوٹلوں اور شاہی محلوں میں اونچے اینٹیٹیز کے عیاش بدمست لوگوں کے پاس پہنچائے جاتے تھے۔ کبھی ایک دن، کبھی ایک ہفتہ اور کبھی مہینوں کے لیے منہ مانگی قیمت پر ان کی بکنگ ہوتی تھی۔

وہاں ٹریزر کے طور ایک بوڑھی اور دو جوان عورتیں تھیں۔ وہ انہیں تربیت دیتی تھیں۔ لڑکوں کو بڑے دھیمے لہجے میں بڑی نزاکت سے بولنا سکھاتی تھیں۔ بل کھا کر بیٹھنے اٹھنے اور ہر قدم پر لہرا کر چلنے کی ادائیں سکھاتی تھیں۔

ان عورتوں نے وسیم کے بدن کو ٹٹول کر کہا۔ "یہ بہت حسین ہے مگر نازک نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں مردانہ سختی آ رہی ہے۔ اسے زیادہ دنوں تک دھندے میں رکھا نہیں جا سکے گا۔"

ابو ولاد نے کہا۔ "یہ جب تک کیش ہوتا رہے گا، تب تک اسے رکھا جائے گا۔ پھر چھوڑ دیا جائے گا۔"

وسیم نے کہا۔ "میں ایسا گناہ نہیں کروں گا، مجھے جانے دو۔ میں اپنی سسٹر کے پاس جاؤں گا۔"

"ہماری بات مانو گے تو اپنے گھر جا سکو گے۔ تم نے سنا نہیں کہ زیادہ دنوں تک ہمارے کام نہیں آؤ گے؟ جلد ہی تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔"

"مجھے زیادہ دنوں کے لیے نہیں، تھوڑے دنوں کے لیے ہی سہی مگر گناہ گار کیوں بناؤ گے؟ میں شہید اعظم سراج مصطفیٰ کا بھائی ہوں۔ کم از کم مجھے تو معاف کر دو۔"

ایک بے یار و مددگار کو بڑے بھائی کی شہادت اور قربانیوں کا کوئی مول، کوئی انعام نہیں مل رہا تھا۔ محبانِ وطن اپنی قوم کی خاطر غاصبوں سے برسرِ پیکار تھے۔ جان کی بازیاں لگا رہے تھے۔ اتحادیوں کے تمام پریس، تمام چینلز بہت ہی مستعد اور مؤثر تھے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے انہیں شہید تسلیم کرنے کے بجائے باغی اور دہشت گرد کے طور پر دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہے تھے۔

وسیم شہید ہونے والے بھائی کے حوالے سے کوئی انعام نہیں چاہتا تھا۔ اس کی التجا اتنی تھی کہ اسے عزت اور تحفظ حاصل ہو جائے اور ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ان کے احکامات کی تعمیل نہ کرتا تو بے موت مارا جاتا۔ اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنی سسٹر کے پاس جانا تھا۔ لہٰذا قہراً و جبراً عشوہ طرازی کی تربیت حاصل کرنے لگا۔

یہ بات دل میں تھی کہ گناہ کا کھیل شروع ہونے سے پہلے کسی طرح وہاں سے نکل بھاگے گا۔ ہو سکتا ہے بچ نکلے اور اپنی سسٹر کی آغوش میں پہنچ جائے۔ اسے رہ رہ کر اس کے نرم و گداز بدن کی قربت یاد آتی تھی۔ وہ سحر زدہ سا ہو کر اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔

یاقوت تک پہنچنے کے لیے وہ جان کی بازی لگانے والا تھا۔ اسے موت منظور تھی، شرمناک فعل منظور نہ تھا۔

اگلے سات دنوں تک وہ بے دلی سے تربیت حاصل کرتا رہا۔ ایک کمرے کی جالی دار کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ وہ چھوٹی سی عمارت شہر سے کہیں دور تھی۔ بہت دور دو مکانات دکھائی دیتے تھے۔ مسلح افراد پہرا دیتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دن رات ان کی ڈیوٹی رہتی تھی۔

وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا، کیا جبراً گناہوں کی دلدل میں اترنا ہو گا؟ یہ سوچ کر ہی اسے شرم آتی تھی کہ مرد ہو کر عورتوں کی طرح مستعمل ہو گا۔

اس کے سر پر ریشمی بالوں کی وگ اور جسم پر زنانہ لباس آ گیا تھا۔ وہ یوں بھی حسین تھا۔ ایک بیوٹیشن نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ مختلف زاویوں سے اس کی دلکش تصاویر اتاری گئیں۔ اس کی البم بنا کر عیاش اُمرا کو بھیج دی گئی۔

بالی عمر کے نسوانی لڑکوں کی طلب کہاں نہیں تھی؟ اس کی البم دیکھ کر کئی رئیسوں نے بولیاں دیں۔ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار داؤد واسرار نے سب سے کم بولی دی مگر دھمکی بڑی دی کہ وسیم عرف وسیمہ کو ایک ہفتے کے لیے اس کے پاس نہ چھوڑا گیا تو وہ ابو ولاد کا دھندا چلنے نہیں دے گا۔

ابو ولاد نے فوراً ہی وسیم کو داؤد محل پہنچا دیا۔ وہ اس دھندے میں پڑنے سے پہلے ہی فرار ہونے کی فکر میں تھا۔ لیکن اس وسیع و عریض محل میں پہنچ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہاں جگہ جگہ سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ الیکٹرونک آلات کے ذریعے وہاں آنے اور جانے والوں کو دیکھا جاتا تھا۔ سیکیورٹی افسر کی اجازت کے بغیر وہ محل کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

محل میں داؤد واسرار کی ایک بیوی اور ایک جوان بیٹی بھی تھی۔ محل کے ایک حصے میں تین کنیزیں تھیں۔ نئی آتی رہتی تھیں، پرانی چلی جاتی تھیں۔ داؤد واسرار نے حرم سرا میں آ کر وسیم کو وسیمہ کے روپ میں دیکھا تو خوش ہو کر دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "کیا قیامت کا حسن ہے؟ تم تو مجھے لوٹ لو گی۔ آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہا تھا۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا رہا۔ داؤد نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے کسمسانے لگا۔ داؤد نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جو راضی نہیں ہوتی، نخرے کرتی ہے، خود کو چھڑاتی ہے، اِدھر سے اُدھر بھاگتی ہے، اُسے پکڑنے اور زیر کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔"

وہ خود کو چھڑا کر الگ ہو گیا۔ وہاں کی کنیزیں ادب سے کھڑی تھیں۔ داؤد نے ایک سے کہا۔ "ایک بڑا پیگ بناؤ۔ یہ نئی نویلی کچھ زیادہ ہی نخرے دکھا رہی ہے۔ پینے سے مزہ آئے گا۔"

پھر وہ وسیم سے بولا۔ "یہ جو تین کنیزیں ہیں، ان میں بس یہ ایک کنیز ہے، باقی یہ دونوں تمہارے جیسی ہیں۔ مجھے عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تم آئے ہو تو میں ان سب کو رخصت کر دوں گا۔"

کنیز نے ایک ڈبل پیگ بنا کر پیش کیا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر دوسرا ہاتھ وسیم کی کمر میں حمائل کرتے ہوئے بولا۔ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست..."

اس نے جام کو ہونٹوں سے لگایا۔ وسیم نے زیرِ لب ایک موٹی سی گالی دی اور بڑے موقع سے دی۔ وہ گالی بددعا کی طرح لگی۔ ایک گھونٹ لیتے ہی ٹھسکا لگا۔ وہ ایک دم سے جھٹکا کھا کر کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے وسیم سے دور چلا گیا۔

اس نے دعا مانگی۔ ''اللہ کرے یہ کھانستے کھانستے باہر چلا جائے پھر واپس نہ آئے۔''

ایسی دعائیں قبول نہیں ہوتیں کیونکہ مصیبتیں فوراً جانے کے لیے نہیں آتی ہیں۔ داؤد کو ذرا سکون ملا وہ تھوڑی دیر ہانپنے کے بعد پھر پینے لگا اور سر گھما کر وسیم کو دیکھنے لگا۔

وہ اس کے قریب جا کر دور ہو گیا تھا۔ کوئی چیز ملتے ملتے نہ ملے تو اس کی اہمیت اس کی کشش بڑھ جاتی ہے۔ وسیم کا سراپا للچا رہا تھا۔ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اس نے ڈبل پیگ کا آخری گھونٹ پیا۔ پھر شیشے کے پیالے کو ایک صوفے پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اے فتنہ...! آ اور قیامت بن جا۔ شتاب آ کہ نہیں تاب اب جدائی کی...''

وہ بولتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ جبر بڑھتا ہے تو پھر رکتا نہیں۔ اب وہ اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ مرد تھا اور مرد بن کر حالات کا مقابلہ کرتا۔ وہاں سے فرار ہوتا' گولیوں کا نشانہ بنتا یا پھر گرفتار ہو کر مار کھاتا۔ کسی ٹارچر سیل میں پھینک دیا جاتا یا قسمت ساتھ دیتی تو زندہ سلامت اپنی سسٹر کے پاس پہنچ جاتا۔

وہ ایک دم سے تن گیا۔ داؤد اس کی طرف آیا مگر رک گیا۔ اس کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ ''شٹ...''

پھر فون نکال کر کان سے لگایا اور جھنجلا کر اپنے پی اے سے کہا۔ ''نان سنس! کیا بہت ضروری کال ہے؟''

پی اے نے کہا۔ ''یس سر! رتھ سینٹرل زون سے میجر ڈوگلس آن لائن ہیں۔''

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ بات کراؤ۔''

فوراً ہی رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف سے گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہاں مجاہدین کے ایک گروہ نے میزائل پھینکا تھا۔ معمولی سا نقصان ہوا تھا مگر اپنے مخصوص سرکاری عہدے داروں کو غصہ دکھایا جا رہا تھا۔

عراق کے شمالی علاقوں میں اتحادی فوج کا قبضہ تھا۔ وہاں ان کی گرفت مضبوط تھی۔ غصہ اس بات کا تھا کہ بغداد کے کسی حصے سے وہاں کی ایک فوجی بیرک میں میزائل پھینکا گیا تھا۔

اتحادی آقا یہ الزام دے رہے تھے کہ بغداد کے کٹھ پتلی حکمران غافل ہیں۔ اپنے آقاؤں کو پوری طرح تحفظ فراہم نہیں کر رہے۔ داؤد اسرار فون پر ''یس سر! یس سر! جی جناب! جی حضور!'' کہہ رہا تھا۔ انہیں یقین دلا رہا تھا کہ بغداد کی پوری پولیس فورس کے ساتھ مجاہدین کے ٹھکانوں پر حملے کرے گا۔ اور انہیں بغداد سے نابود کر دے گا۔

اس نے ایک آقا کو تسلیاں دے کر فون بند کیا۔ پھر وسیم کو دیکھا۔ وہ ہوس کے دسترخوان پر رکھا ہوا تھا مگر اسے چبانا تو دور کی بات ہے' چکھنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ اپنی مستی اور مسرتوں سے پہلے گورے آقاؤں کو مطمئن کرنا لازمی تھا۔

وہ وہاں سے چلتا ہوا محل کے دوسرے حصے میں اپنی شریک حیات کے پاس آیا۔ اسے بتایا کہ آرمی ہیڈ کوارٹر سے اچانک کال آئی ہے۔ وہ باغیوں کی سرکوبی کے لیے جا رہا ہے۔ پتا نہیں واپسی کب ہوگی؟

بیوی نے پوچھا۔ ''رات کو تو واپس آ جائیں گے؟''

''نہیں۔ مجھے باغیوں کے خلاف کچھ کارکردگی دکھانے کے بعد ہیڈ کوارٹر جانا ہوگا۔ شاید کل واپسی ہوگی۔''

''آپ نے حرم سرا میں خوا تین کی بھیڑ لگا رکھی ہے۔ ایسی بھی کیا ہوس ہے؟ کچھ تو خیال کریں' ہماری جوان بیٹی کیا سوچتی ہوگی؟''

اس نے بیٹی کے بارے میں پوچھا۔ ''سارہ کہاں ہے؟''

''اپنے بیڈ روم میں ہے۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی' آج کوئی نئی لڑکی آئی ہے۔ یہ کب تک رہے گی؟''

داؤد نے سنجیدگی سے سوچتے ہوئے حرم سرا کی طرف کو دیکھا پھر کہا۔ ''یہ جو نئی آئی ہے اسے رہنے دو۔ باقی تینوں کو یہاں سے رخصت کر دو۔''

بیوی نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ نئی آئی نہیں ہے' آیا ہے۔ توبہ توبہ... ہماری سارہ ابھی نادان ہے۔ یہ نہیں جانتی کہ اس کے ابا حضور کیسے کیسے شوق فرماتے ہیں؟''

وہ گھور کر بولا۔ ''طعنے نہ دو۔ شکر کرو' کسی کو نکاح پڑھا کر نہیں لاتا۔ میری دولت اور جائداد کی وارث صرف تم سے ہونے والی اولاد ہوگی۔ اسی لیے تم یہاں آنے والی عارضی سوکنوں کو برداشت کرتی ہو۔''

بیوی نے پوچھا۔ ''سوکن بننے والے مردوں کو کیا کہتے ہیں؟ میں انہیں اپنی سوکن کہوں یا رقیب...؟''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''کچھ بھی کہہ لو۔ بیٹی کا خیال رکھو۔ وہ انجان ہے' اسے انجان رہنے دو۔ یہ معلوم نہ ہونے دو کہ یہاں لڑکیاں بن کر آنے والے دراصل لڑکے ہوتے ہیں۔''

وہ کمرے سے نکل کر بیٹی کے پاس آیا تو وہ بولی۔ ''ہائے پاپا! میں ابھی آپ کے پاس ہی آنے والی تھی۔''

''پاپا کی جان! میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ تم ملکی حالات کو سمجھتی ہو۔ میں کل تک آ جاؤں گا۔ بس اپنی بیٹی کو پیار کرنے آیا ہوں۔''

وہ اس کی پیشانی چوم کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنی بچی کے لیے ایک شریف اور آئیڈیل باپ تھا۔ باقی دنیا کے تمام بچوں کے لیے ایک عیاش درندہ تھا۔ ایسے درندے عیاش کسی بچے کی پیشانی کو پدرانہ شفقت سے کبھی نہیں چومتے۔

سارہ باپ کے جانے کے بعد ماں کے پاس آئی۔ وہ اپنے شوہر کے پی اے سے کہہ رہی تھی۔ ''ابو ولاد کو فون کرو۔ اس سے بولو صرف آج آنے والی لڑکی یہاں رہے گی۔ وہ باقی گند سمیٹ کر یہاں سے لے جائے۔''

پی اے حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا۔ وہ بیٹی سے بولی۔ ''تمہارے پاپا آرمی ہیڈ کوارٹر جائیں گے۔ کل سے پہلے نہیں آئیں گے۔ انہوں نے تم سے کچھ کہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''کوئی خاص بات نہیں کی۔ ویسے آپ نے اس نئی لڑکی کو دیکھا ہے؟''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''نہیں۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میں نے اسے دور سے دیکھا ہے۔ بہت حسین ہے۔''

وہ بولی۔ ''اونہہ... تمہاری ماں کی جان جلانے آئی ہے۔''

''پلیز! آپ پاپا کے خلاف کچھ نہیں کہیں گی۔ وہ آتی ہیں تو کیا ہوا؟ چلی بھی تو جاتی ہیں۔''

''ہاں۔ تمہارے پاپا بہت اچھے ہیں۔ کسی کو میری مستقل سوکن بنا کر نہیں لاتے مگر ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟''

''آپ کو کیا تکلیف ہے ماما...!''

''جب تمہاری شادی ہوگی اور تمہارا شوہر ایسی حرکتیں کرے گا' تب جانو گی کہ یہ سراسر ہوس پرستی ہے... تعجب ہے' مردوں کی بھوک کبھی نہیں مٹتی۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سارہ کو حرم سرا میں آنے والی لڑکیوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر تنہائی میں ان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ شہر کے حالات ایسے تھے کہ وہ تفریح کے لیے کہیں باہر جانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے محل میں آنے والی لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرکے دل بہلاتی تھی۔

وہ ایک گھنٹے بعد محل کے ایک کمرے میں آئی۔ وہاں وسیم بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ سارہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ ایک اور لڑکے کو لڑکی بنا کر لایا گیا ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میرا نام سارہ ہے۔ داؤد اسرار میرے پاپا ہیں۔''

اس کی آنکھوں سے اچانک نفرت جھلکنے لگی۔ وہ ایک ظالم عیاش شخص کی بیٹی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ بولا۔ ''وسیم... وس... وسیم...''

اسے ٹریننگ کے دوران تاکید کی گئی تھی کہ وہ خود کو کبھی ایک لڑکا نہ کہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ وسیم مر چکا ہے۔

سارہ نے کہا۔ ''یہاں صرف تم رہوگی۔ باقی وہ تینوں جا چکی ہیں۔''

''جبکہ مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔''

''تم بدنصیب کیوں ہو؟ کیا یہاں رہنا نہیں چاہتیں؟''

''نہیں۔ میں اپنی سسٹر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔''

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''مجھے زبردستی لایا گیا ہے۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ میں پاپا سے کہوں گی' وہ تمہیں تمہاری سسٹر کے پاس پہنچا دیں گے۔''

اسے سارہ کی معصومیت اچھی لگی۔ وہ اسے یاقوت کے پاس پہنچانے کی بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''جانتی ہو' تمہارا باپ مجھے کس لیے یہاں لایا ہے؟''

''میں بچی نہیں ہوں۔ پورے اٹھارہ برس کی ہوں۔ سب سمجھتی ہوں مگر پہلی بار سن رہی ہوں کہ تمہیں یہاں زبردستی لایا گیا ہے۔ پہلے کبھی کسی نے شکایت نہیں کی۔''

''میں دوسروں کو نہیں جانتی۔ تم اپنی باتوں سے بہت اچھی اور سمجھدار لگ رہی ہو۔ کیا تم مجھے یہاں سے رہائی دلا سکتی ہو؟''

''ہاں۔ پاپا آئیں گے تو میں ان سے کہوں گی۔ وہ تمہیں تمہاری بہن کے پاس پہنچا دیں گے۔''

''میری کوئی بہن نہیں ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں لہو کا ایک رشتہ بھی نہیں ہے۔''

''پھر تم سسٹر کسے کہتی ہو؟''

''اس کا نام یاقوت ہے۔ میں اسے بچپن سے سسٹر کہتی ہوں مگر وہ بہن نہیں لگتی' میرے دل کو لگتی ہے۔ پلیز! مجھے اس کے پاس پہنچا دو۔''

سارہ حیرانی سے بولی۔ ''تم لڑکی ہو! مگر ایک لڑکے کی طرح یاقوت سے ملنے کی بات کر رہی ہو؟''

''اس بات کو چھوڑو... بس تم خدا کے لیے مجھے اس محل سے باہر نکال دو۔''

''باہر جتنے سیکیورٹی گارڈز ہیں' وہ پاپا کی اجازت کے بغیر نہ تو کسی کو باہر جانے دیتے ہیں' نہ کسی کو اندر آنے دیتے ہیں۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں رہائی مل جائے گی۔ پاپا کو آنے دو۔''

''تمہارا باپ میری زندگی تباہ کیے بغیر' گناہ کیے بغیر مجھے یہاں سے جانے نہیں دے گا اور میں جان پر کھیل کر بھی یہاں سے جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔''

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ جوش اور جذبے کے

چھپی سی گڑبڑ ہونے لگی ہے۔

ماں حرم سرا کے ایک دروازے پر رک گئی۔ اسے خیال آیا۔ ”اس نئی آنے والی یا والے کو دیکھنا چاہیے۔ یہ داؤد چھٹا ہوا عیاش ہے۔ پتا نہیں، حسین چھوکروں کو کہاں کہاں سے پکڑ کر لے آتا ہے؟“

بیٹی نے کہا تھا، وہ حرم سرا میں سو رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی، ماں اُدھر نہ جائے مگر وہ دروازے تک آ ہی گئی۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔ وسیم سارہ کے انتظار میں لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا، شاید آ گئی ہے۔

وہ بستر سے اتر کر دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا۔ سارہ نے کہا تھا، دستک کے ساتھ جب تک میں آواز نہ دوں، دروازہ نہ کھولنا۔

وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ دوسری بار دستک ہوئی۔ وہ آواز سننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف بیگم داؤد نے سوچتی ہوئی نظروں سے بند دروازے کو دیکھا۔ بیٹی کی بات یاد آئی کہ وہ سو رہی ہے۔ اس نے پھر دستک نہیں دی۔ وہاں سے جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اُدھر وسیم بھی بیڈ کی طرف جانے کے لیے پلٹنے لگا تو فلاور اسٹینڈ سے ٹکرا گیا۔ وہاں رکھے ہوئے گل دان نے فرش پر گر کر شور مچایا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔ اس نے دستک دیتے ہوئے کہا۔ ”دروازہ کھولو...“

اس کے کانوں میں سارہ بول رہی تھی۔ اس نے لاک ہٹا کر دیکھا تو ایک دم سے گھبرا گیا۔ دھان پان سی سارہ کے بجائے ایک بھرپور جوان عورت نظر آ رہی تھی۔ بیگم داؤد اسے چند لمحوں تک دیکھتی رہ گئی۔ وہ کسی لڑکی کو دیکھنے آئی تھی۔ سامنے ایک خوبرو جوان دکھائی دے رہا تھا۔ وسیم نے دروازہ بند کرنا چاہا۔ وہ اسے دھکا دیتی ہوئی اندر آ گئی اور ذرا سخت لہجے میں بولی۔ ”تم نے لڑکی کا گیٹ اپ کیوں اتارا ہے؟ کیا تمہیں تاکید نہیں کی گئی ہے کہ یہاں خود کو ظاہر نہیں کرنا ہے؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، مگر...“

”اگر مگر کیا کرتے ہو؟ ہماری بیٹی نادان ہے۔ وہ نہیں جانتی کہ اس کا باپ یہاں لڑکیوں کے بھیس میں لڑکے لاتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے ایسی شرمناک حرکتوں کا علم ہماری بیٹی کو ہو۔“

وہ بیگم صاحبہ سے بول نہیں سکتا تھا کہ بیٹی سب کچھ جان گئی ہے۔ تم یہاں سے دفع ہو گی تو وہ میری رہائی اور آزادی کے لیے اِدھر آئے گی۔

وہ بولی۔ ”مجھے داؤد کو انفارم کرنا ہوگا۔ تم یہاں اصول کے خلاف حرکتیں کر رہے ہو۔“

وہ پلٹ کر جانا چاہتی تھی۔ وسیم نے گھبرا کر تڑپ کر اس کے بازو کو پکڑ لیا۔ وہ جہاں تھی، وہیں تھم گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے بھرے بھرے بازو پر اس کی گرفت دیکھی۔ اس گرفت نے سمجھا دیا کہ وہ نازک اندام دکھائی دینے والا باہر سے سرد ہے، اندر سے مرد ہے۔ اس کا ایک پنجہ بازو کے گوشت میں پیوست ہو گیا تھا۔ اندر تک محسوس ہو رہا تھا۔

وسیم نے سوچا، یہ فون کرے گی تو داؤد ابھی آ جائے گا۔ پھر وہ وہاں سے فرار نہیں ہو سکے گا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”اسے فون نہ کرو۔ میں ابھی لڑکی بن جاؤں گا۔ تم یہاں سے جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہاری بیٹی مجھے لڑکی کے روپ میں ہی دیکھے گی۔“

اس نے بازو چھوڑ دیا۔ بیگم داؤد کو یوں لگا وہ جیسے بے سہارا ہو گئی ہے۔ کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ”میں سچ کہتا ہوں۔ نہیں، سچ کہتی ہوں۔ ابھی دروازہ بند کروں گی پھر دو گھنٹے بعد لڑکی بن کر تمہارے پاس آؤں گی۔“

بیگم داؤد اسے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دروازے تک آئی۔ دل کہہ رہا تھا، ابھی نہ جائے۔ اسے اچھی طرح دیکھے سمجھے کہ وہ جیسا لگ رہا ہے، ویسا ہی ٹھوس ہے یا محض فریب ہے۔

وہ بولی۔ ”دروازہ بند کرو۔ سارہ آ جائے گی۔ میں جا رہی ہوں۔ یہاں پہرے دار آتے رہتے ہیں۔ میں پھر کسی وقت آؤں گی۔ ان پہرے داروں کی موجودگی میں تمہارے ساتھ چائے پیوں گی اور باتیں کروں گی۔“

وسیم نے فوراً ہی دروازہ بند کر لیا اور زیرِ لب بڑبڑانے لگا۔ ”یہ بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ بیٹی کو آنا چاہیے تھا۔ ماں آ گئی۔ پتا نہیں، وہ کب آئے گی؟ میں یہاں سے کب نکل سکوں گا؟“

وہ وہیں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ دل کہہ رہا تھا، سارہ ابھی آئے گی۔ بس آنے ہی والی ہے۔

بیگم داؤد سوچ میں ڈوبی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کا بازو دُکھ رہا تھا۔ بڑی مدت کے بعد کسی مردانہ گرفت میں آیا تھا۔ اُسے جگا رہا تھا۔ ورنہ وہ تو خود کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی تھی۔ وہ نام کی سہاگن تھی۔ شوہر ایسا عیاش تھا کہ مدتوں ہوئیں بیوی کو بھول چکا تھا۔ ایسا بدذوق تھا کہ لڑکوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ اس کے اندر فطری نسوانی کشش مر چکی تھی۔

اس پر ستم یہ کہ اسے سخت پردے میں اور پابندیوں میں رکھتا تھا۔ باہر جو مسلح گارڈز تھے، ان میں مخنث بھی تھے۔ ماضی میں محل سراؤں کے اندر خواجہ سراؤں کو رکھا جاتا تھا۔ داؤد بھی جانتا تھا کہ بھرپور جوان عورت کو صرف بیوی بنا کر رکھو، ہاتھ نہ لگاؤ تو وہ ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتی ہے۔

لہٰذا وہ اپنی بیوی کو ہی نہیں، بیٹی کو بھی سخت نگرانی میں رکھتا تھا۔ کسی رشتے دار سے تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں سیکیورٹی گارڈز کسی رشتے دار کو محل میں داخل ہونے نہیں دیتے تھے۔ یورپ اور امریکا کے آزاد ماحول میں بھی ویسی ہی پابندیاں عائد رہتی تھیں۔

اس کے چھ سیکیورٹی گارڈز مخنث تھے۔ ملک کے باہر بھی ماں بیٹی کو اپنی نگرانی میں رکھتے تھے۔ بیگم صاحبہ کے متعلق داؤد کو یہ رپورٹ پہنچاتے تھے کہ وہ نیک اور پارسا ہے۔

وہ اپنے فطری تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھی لیکن مجبوراً پارسا بن کر رہتی تھی۔ یہ نہیں چاہتی تھی کہ داؤد کسی کو نکاح پڑھا کر لے آئے اور اس کے اور بیٹی کے حقوق مارے جائیں۔ اس لیے وہ اس عیاش مرد کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ عراق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک موت رقص میں رہتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اُسی کے ساتھ رہتی تھی۔

داؤد اپنے ذوق وشوق سے مجبور تھا۔ اسے عورتوں سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے دوسری وہ شادی نہیں کرتا تھا۔ برسوں سے بیگم کو پرکھتا آ رہا تھا۔ مطمئن تھا کہ بیوی کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔

عورت کو لاکھ ٹھنڈا کرو، راکھ تلے چنگاری ضرور رہتی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً بیڈ روم میں بند رہ کر کمپیوٹر کا سہارا لیتی تھی اور اپنے فطری جذبات کی تسکین کر لیا کرتی تھی۔

وہ اپنے بازو کو سہلانے لگی۔ بڑی مدت کے بعد ایک مردانہ ہاتھ نے اسے جکڑا تھا۔ اگرچہ بازو گرفت میں نہیں تھا مگر ہنوز جکڑی ہوئی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ہزار ہا پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود محل کی اُونچی چار دیواری میں ایک مسیحا آ گیا تھا۔ اب وہ دوا دارو کرائے گی۔ مُردار حرام ہے لیکن دوا تو حلال ہے۔

سارہ نے ایک کمرے میں آ کر دیکھا۔ وہاں اس کے مقتول کزن کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک اٹیچی میں اس کے تین جوڑے تھے۔ اس نے اندازہ لگایا، وہ تقریباً وسیم کے ناپ کے تھے۔ وہ انہیں اپنے بیڈ روم میں لے آئی۔ وہاں بیٹھ کر بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ لباس کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ وسیم اسے پہن کر یہاں سے بھاگ جائے گا مگر میں نہیں چاہتی کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔

’اگر میں پاپا سے کہوں گی کہ وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنے دیں تو وہ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ وہ اسے برے ارادے سے لائے ہیں۔ اسے بازاری لڑکا کہہ کر میرے حوالے نہیں کریں گے۔ میں ان کے مزاج کو خوب سمجھتی ہوں۔ انہیں شرم آئے گی کہ جسے اپنے لیے لائے ہیں، اسے میں اپنے لیے رکھنا چاہتی ہوں۔‘

وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ’پاپا کبھی نہیں مانیں گے۔ وسیم کے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ یا خدا...! میں کیا کروں؟ وہ نہ جائے تو اچھا ہے۔ جائے گا تو اسے نہیں روکوں گی... مصیبت میں پڑنے نہیں دوں گی۔‘

وہ کپڑے لے کر کمرے سے نکلی۔ ماں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ محتاط انداز میں چھپ کر حرم سرا میں آئی۔ ہولے سے دروازے پر دستک دے کر بولی۔ ”میں ہوں... دروازہ کھولو۔“

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سارہ نے اندر آ کر کہا۔ ”لو۔ یہ کپڑے پہن کر دیکھو۔ میرا خیال ہے، اس سے گزارہ ہو جائے گا۔“

وہ کپڑے لیتے ہوئے بولا۔ ”گڑبڑ ہو گئی ہے۔ تمہاری ماں آئی تھی اور میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔“

”میں کیا کروں؟ تم ماں بیٹی کی آواز ایک جیسی ہے۔ میں سمجھا تم ہو۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو تمہاری والدہ تھیں۔“

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”پہلے تو انہوں نے دھمکی دی کہ تمہارے پاپا کو فون کریں گی۔ پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا، غلطی ہو گئی ہے۔ اب میں لڑکی بن کر رہوں گا تو وہ مان گئیں۔“

”وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ انہوں نے یہاں سے جا کر پاپا کو فون کر دیا ہوگا۔ وہ مصروف ہوں گے ورنہ اب تک ان کا ردِعمل سامنے آ جاتا۔ لیکن کسی وقت بھی وہ آ سکتے ہیں یا سیکیورٹی افسر یہاں آ کر تمہیں کسی کمرے میں بند کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔ میں ابھی یہ کپڑے پہن کر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔“

”کیا باہر جا کر مرنا چاہتے ہو؟“

”میں یہاں رہ کر بازاری لڑکا نہیں بنوں گا۔“

”میں تمہیں بننے نہیں دوں گی۔ ابھی تو اس کمرے سے نکلو۔ مام اور گارڈز کسی وقت بھی آ سکتے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر... کمرے سے باہر لے آئی۔ اس نے پوچھا۔ ”مجھے کہاں چھپاؤ گی؟“

”خاموش رہو۔ دبے پاؤں چلو۔ آہٹ نہ ہونے پائے۔“

وہ اس کے ساتھ دبے قدموں چلتا ہوا لاؤنج میں آیا۔ بیگم داؤد اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ وسیم کا ہاتھ سارہ کے

ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا ایک بہت ہی آراستہ خواب گاہ میں آ گیا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرا بیڈ روم ہے۔ تم یہاں سے بھاگنے والے تھے۔ سمجھو کہ فرار ہو چکے ہو۔“

”کیسے سمجھ لوں؟ جبکہ اسی چار دیواری میں ہوں۔“

”ابھی معلوم ہو جائے گا۔ جب تم کسی کو نظر نہیں آؤ گے۔ پورے محل میں تمہیں تلاش کیا جائے گا۔ اندر اور باہر کہیں دکھائی نہیں دو گے تو وہ سب حیران اور بے یقینی کے باوجود یقین کرلیں گے کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔“

”کیا میں اس کمرے میں قیدی بن کر رہوں گا؟“

”فی الحال تم مصیبتوں سے بچ گئے ہو۔ پاپا یہاں تم سے زیادتی کرنے نہیں آئیں گے۔ کوئی یہاں آیا تو میں تمہیں اسٹور میں چھپا دوں گی۔ میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ ایک اسٹور روم میں آیا۔ وہاں مختلف قسم کا فاضل اور غیر ضروری سامان بھرا پڑا تھا۔

پھر وہ اس کے ساتھ اسٹور روم سے نکل کر ایک باتھ روم میں آیا۔ اس کی پچھلی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ سارہ نے اسے کھولتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسٹور روم کا دوسرا دروازہ ہے۔ تم یہاں سے سامان کے پیچھے پہنچو گے۔“

وسیم نے دروازے سے گزر کر اندر قدم رکھا۔ آگے بڑھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بھاری سامان نیچے سے اوپر تک رکھا ہوا تھا۔ سارہ نے اس کی چٹخنی لگا کر کہا۔ ”یہ یہاں سے بند ہو چکا ہے۔ اسے میرے باتھ روم سے کھولا نہیں جاسکے گا۔ تم یہاں کئی گھنٹوں تک آسانی سے چھپے رہو گے۔“

وہ دونوں وہاں سے نکل کر کمرے میں آ گئے۔ سارہ نے کہا۔ ”تم کپڑے بدلو۔ میں کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔ ویسے اس فریج میں بھی کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ یہ بعد میں کام آئیں گی۔“

اس نے خواب گاہ سے باہر جا کر دروازہ بند کر دیا۔ وسیم نے فوراً ہی لڑکیوں کے لباس سے نجات حاصل کی۔ مردانہ لباس پہن کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ حلیہ بدل چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک مرد کی حیثیت سے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

سارہ ایک ٹرے میں کھانا لے آئی اور میز پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”جلدی کھاؤ۔ تمہیں چھپنا ہے۔ تمہارے فرار ہونے کا ڈراما لے کرنا ہے۔“

وہ صبح سے بھوکا تھا۔ جلدی جلدی کھانے لگا۔ ”تمہاری ماں نے کہا تھا' وہ میرے پاس کسی وقت آئیں گی۔ یہاں مخنث پہرے دار ہوتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں مجھ سے باتیں کریں گی۔ تم نے اچھا کیا' مجھے یہاں لے آئیں۔ اسٹور روم ایسا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔“

”تم جس قدر محتاط رہو گے' اتنے ہی محفوظ رہو گے۔ منہ سے آواز بالکل نہ نکالنا' نہ آہٹ پیدا کرنا۔ بس ایک بار انہیں یقین ہو جائے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ پھر کوئی یہاں نہیں آئے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ اس کے ساتھ واش روم میں آیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر کے کہا۔ ”تم کمرے میں گونگے بن کر رہو گے۔ کھانسے کھنکارنے کی آواز بھی نہیں نکالو گے۔ کوئی ضروری بات کہنا ہو تو کاغذ پر لکھو گے یا ہم باتھ روم میں آ کر بات کریں گے۔“

ان کی آواز باتھ روم سے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ مگر کمرے سے باہر نہیں جا رہی تھی۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بات کرتے ہوئے اس کے قریب ہو۔ ان کے ملبوسات ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔

وہ پہلی بار تنہائی میں ایک اجنبی کے اتنے قریب آئی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اچانک ہی تیز ہو گئیں۔

وہ فرش پر پڑے ہوئے اس کے کپڑوں کو اٹھا کر بولی۔ ”اب تم اسٹور میں جاؤ اور یہ سمجھ لو کہ بیٹھے بیٹھے رات ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے اتنی دیر نہ ہو۔ انہیں جلد ہی یقین ہو جائے گا تم اس محل سے جا چکے ہو۔“

”میں دعا مانگتا رہوں گا کہ یہاں سے بچ نکل جانے کا موقع مل جائے۔“

وہ بولی۔ ”میں بھی دعا کروں گی کہ تمہاری دعا قبول ہو جائے۔“

وہ باتھ روم کا پچھلا دروازہ کھول کر اسٹور میں چلا گیا۔ وہاں اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب اسے باتھ روم سے کھولا نہیں جا سکتا تھا۔

سارہ اس کے کپڑے اور کھانے کی ٹرے لے کر کچن میں آئی۔ ٹرے کو وہاں رکھا پھر ماں کے کمرے میں آ کر کہا۔ ”مام! وہ لڑکی وسیمہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ اس کا یہ لباس قالین پر پڑا ہوا تھا۔“

وہ بیٹھی ہوئی تھی' حیرانی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ وہ بھلا کہاں جائے گی؟“

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں وسیم کو ایک مرد کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک مسیحا آیا تھا لیکن مریضہ کی نبض ٹٹولنے سے پہلے ہی گم ہو گیا۔ اگر وہ نہ ملا تو اسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ سکتا تھا۔

وہ بدحواس ہو کر دوڑتی پھر رہی تھی۔ محل کے دوسرے حصوں میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے بھوکی پیاسی کے منہ سے لقمہ چھین لیا گیا ہو۔

سارہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے فون کر کے سیکیورٹی افسر سے کہا۔ ”جلدی آؤ۔ وسیمہ یہاں سے بھاگ گئی ہے۔“

وہ کئی گارڈز کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا۔ تمام گارڈز گھر کا کونا کونا دیکھنے لگے۔ سارہ کے بیڈ روم میں بھی آئے۔ اسٹور میں بھی گئے۔ ان کی عقل نے یہی سمجھایا کہ وہاں چھپنے کے لیے کوئی بھاری سامان تنہا نہیں ہٹا سکتا۔

سارہ کہہ رہی تھی۔ ”میں اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند رکھتی ہوں۔ کوئی میرے کمرے میں آ ہی نہیں سکتا۔“

سیکیورٹی افسر نے تھک ہار کر اعتراف کیا کہ وسیم فرار ہو گیا ہے۔ مگر کیسے...؟

وہ محل سے باہر کس سمت گیا ہوگا؟

احاطے کے اندر باغیچے سے گزرتے وقت کسی گارڈ کو نظر کیوں نہیں آیا؟

انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کسی نہ کسی گارڈ سے غفلت اور بے پروائی ہوئی ہے۔ وسیم اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گیا ہے۔

سیکیورٹی افسر نے داؤد اسرار کو فون پر اطلاع دی اور جواباً گالیاں سنیں۔ وہ غصے سے گرج رہا تھا' حکم دے رہا تھا کہ تمام گارڈز کی چھٹی کر دی جائے۔ ان کی جگہ دوسرے لائے جائیں۔

اس نے ابو ولاد کو حکم دیا۔ ”وسیمہ کو کسی بھی طرح تلاش کرو۔ ایک معمولی سا لڑکا میری سیکیورٹی توڑ کر گیا ہے۔ یہ میری توہین ہے۔ اس کے گھر والوں کو پکڑو۔ انہیں ٹارچر کرو۔ ان سے اگلواؤ کہ کہاں چھپا ہے؟ میری تمام پولیس فورس اسے تلاش کرے گی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ اپنے سیکیورٹی افسر اور ابو ولاد پر گرج رہا تھا۔ اپنے ماتحتوں کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ اس لڑکے کو ڈھونڈ کر نہ لایا گیا تو انہیں ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔

وہ اپنے گورے آقاؤں کو مطمئن کرنے کے لیے مجاہدین کے مختلف گروہوں سے نمٹ رہا تھا۔ فی الحال کچھ دنوں تک گھر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ وہاں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی اپنی چھت کے نیچے اپنی بیٹی کی خواب گاہ میں رنگین و سنگین آنکھ مچولی جاری رہنے والی تھی۔

☆☆☆

جب سے صدام حسین کو سزائے موت سنائی گئی تھی تب سے مجاہدین کے حملوں میں شدت آ گئی تھی۔ بیشتر مجاہدین کے گروپس کہتے تھے کہ وہ صدام حسین جیسے ڈکٹیٹر کے حامی نہیں ہیں لیکن امریکا کے کٹھ پتلی حکمرانوں اور عدالت کو سزا سنانے کا حق نہیں ہے۔

اس نقطۂ نظر سے عراق کی عوام سزائے موت کے خلاف تھی۔ صدام حسین کے قانونی مشیر اور وکیل نے رحم کی اپیل کی تھی۔ لہٰذا فی الحال سزائے موت کے حکم کی تعمیل نہیں ہو رہی تھی۔

داؤد اسرار جیسے اعلیٰ عہدے داران اور افسران کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ یہ اندیشہ تھا کہ مجاہدین کے تمام گروپس اب تک منتشر ہیں مگر جلد ہی متحد ہو کر کوئی بڑا حملہ کر سکتے ہیں۔

یہ محض اندیشہ تھا۔ یقین نہیں تھا کہ ان تمام گروہوں کے درمیان اتحاد قائم ہو سکے گا کیونکہ عراق میں سنی اور شیعہ کے گروہ بندی کے دو کنارے تھے۔ کرد باغیوں کی جماعت علیحدہ تھی۔ کوئی گروہ صدام حسین کا حامی تھا۔ کوئی گروہ کٹر مخالفت کرتا تھا۔

تمام مسلمان منتشر تھے۔ امریکی حملے کی ابتدا سے اب تک وہ تمام محبانِ وطن متحد ہو نہیں پائے تھے اور نہ ہی آئندہ اتحاد قائم ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ یوں عراقی عوام کی یہ کمزوری اتحادیوں کی سب سے بڑی طاقت بن گئی تھی۔

عوام کے حوالے سے کمزوری یہ تھی کہ غربت' مہنگائی اور بے روزگاری کے باعث ڈکیتی' اغوا اور قتل کی وارداتیں ہی حصولِ زر کا ذریعہ بن گئی تھیں۔

عبدالمنعم نے مال کمانے کے لیے اپنی بیوی سلیمہ کے گھر واردات کرائی تھی۔ وہ بیوی اور سسر کا قاتل نہیں تھا مگر اس نے قتل کرایا تھا۔ ان کے گھر میں چوری کرائی تھی۔ یوں کمیشن کے طور پر ایک ہزار دینار کمائے تھے۔

اس نے یاقوت اور اس کی ماں کو چیلنج کیا تھا کہ وہ بے یار و مددگار عورتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ وہ اس گھر کو چھوڑ چکا تھا۔ بیوی کو ہلاک کرنے کے بعد ان سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اب اسے نیا گھر مل گیا تھا۔

فائرنگ اور بم دھماکوں میں زیادہ سے زیادہ مرد ہلاک ہو رہے تھے۔ یتیم لڑکیوں اور بیوہ ہو جانے والی عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ منعم جیسے شکاریوں کو ایسی مظلوم عورتیں بہ آسانی مل جاتی تھیں جو اپنے باپ

بھائی یا شوہر کی چھوڑی ہوئی جائداد کی مالک ہوتی تھیں۔

ایسی ہی ایک عورت اسے مل گئی تھی۔ اگرچہ وہ پچاس برس کی تھی۔ لیکن اسے ساری عمر بٹھا کر کھلا سکتی تھی۔ مرنے کے بعد جائداد اس کے نام کر سکتی تھی۔ اس نے پہلی بیوی سلیمہ کی زندگی میں ہی اسے پھانس لیا تھا۔ اور اب عیش کرنے کے لیے اس کے پاس چلا آیا تھا۔

وہ ایسا صابر نہیں تھا کہ اس پچاس برس کی عورت کے مرنے کا انتظار کرتا۔ وہ اس سے جلد ہی نکاح کرنے والا تھا۔ اسے اپنی منکوحہ بنانے کے بعد سلیمہ کے پاس پہنچانے والا تھا۔ یہ ساری پلاننگ وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس بوڑھی عورت کو راضی کر رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد نکاح پڑھوا لے۔ اس کے بغیر ایک چھت کے نیچے رہنا گناہ ہے اور اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔

اسی وقت تین مسلح افراد اس گھر میں داخل ہوئے۔ منعم نے گن پوائنٹ پر آتے ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے لے جا کر پوچھا۔ ”کون ہو تم لوگ؟“

ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم وہ تین ڈاکو نہیں ہیں جو یاقوت کے گھر میں گھسے تھے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ان ڈاکوؤں کو تم لائے تھے، یہاں ہم خود آئے ہیں۔“

تیسرے نے کہا۔ ”ہم یہاں ڈاکا ڈالنے نہیں آئے۔ اُن تین ڈاکوؤں کے نام اور پتا بتا دو، ہم چلے جائیں گے۔“

وہ سہما ہوا تھا۔ ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی طرح ماسک نہیں پہنے ہوئے تھے۔ کھل کر سامنے آئے تھے۔

اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تم لوگوں کو کسی نے میرے خلاف بہکایا ہے۔ میرا کسی ڈاکو سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

ایک نے چاقو نکال کر کھولا۔ پھر اس کی نوک منعم کے حلق پر رکھ کر کہا۔ ”اب جھوٹ بولو گے تو پھر کبھی بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔“

چاقو کی نوک حلق کے قریب چبھ رہی تھی۔ وہ لہو کی پتلی سی دھار بہتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ چاقو بدست نے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ یہ اور گہرائی میں اُترے، بولنا شروع کر دو۔“

وہ موت کے خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ان تین ڈاکوؤں کے نام اور پتے بتانے لگا۔ ایک نے پوچھا۔ ”یہ لوگ کس تھانے میں بھتا پہنچاتے ہیں؟“

اس نے تھانے اور تھانے دار کا نام بتا دیا۔ وہ آگے پیچھے گن کے نشانے پر تھا۔ ایک گن بردار نے کہا۔ ”اس عورت کے سامنے بولو تم نے اپنی پہلی بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

”جبکہ کر رہے ہو۔ اس عورت کے پاس بھی ویسی ہی واردات کرنے آئے ہو۔ کیسے رذیل ہو؟ سلیمہ نے تمہیں پیار دیا، تین وقت کا کھانا کھلایا۔ اپنی شرم، اپنی آبرو تمہارے نام کرتی رہی اور تم نے اسے ہلاک کرا دیا۔“

وہ عورت حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر یہ باتیں سن رہی تھی۔ چاقو بدست نے کہا۔ ”اے بی بی! تمہارے ساتھ بھی یہی ہونے والا تھا مگر اب نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی اور اس کا سسر اسے اپنے پاس بلا رہے ہیں۔“

یہ کہتے ہی اس نے چاقو والا ہاتھ گھمایا۔ سانس کی نالی کے ساتھ گردن شانوں سے کٹ کر الگ ہوتی چلی گئی۔ وہ فرش پر گر کر پھڑ پھڑانے لگا۔ وہ تینوں جس طرح آئے تھے، اسی طرح خاموشی سے چلے گئے۔

اسی رات ایک رئیس اعظم کے بنگلے میں شادی کی تقریب تھی۔ سیکیورٹی کے سخت انتظامات تھے۔ ان کے علاوہ انسپکٹر حشمت کی پولیس فورس بھی وہاں موجود تھی۔ اس تقریب میں خطرہ رئیس اعظم کو اور اس کے رشتے داروں کو نہیں تھا بلکہ سیکیورٹی فراہم کرنے والوں کو تھا۔

انسپکٹر حشمت کے موبائل پر گھنٹی بجی، اس نے فون کان سے لگا کر کہا۔ ”ہیلو...!“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”تمہارا ایک بہنوئی اور دو سالے یہاں سیکیورٹی گارڈز کی وردی میں ہیں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

جواباً کہا گیا۔ ”ہم بھی سیکیورٹی گارڈز کی وردیوں میں ہیں۔ تمہارے بہنوئی اور سالوں کی طرح ہم بھی بہروپیے ہیں۔“

وہ فون کو کان سے لگائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ فون پر کہا گیا۔ ”دیکھ کر بھی پہچان نہیں پاؤ گے۔ تم ہمارے نشانے پر ہو۔ جہاں ہو، وہیں کھڑے رہو۔ حرکت کرو گے یا کسی کو اشارے سے کچھ کہو گے تو مارے جاؤ گے۔“

وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ آسانی سے دھمکیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے چور نظروں سے دائیں بائیں دیکھا۔ مہمان دو دو، چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک چھلانگ لگا کر مہمانوں کے پیچھے جا سکتا تھا۔

پھر یہ معلوم ہو جاتا کہ واقعی کسی کے نشانے پر ہے یا محض دھمکی دی جا رہی ہے۔ یہ یقین تھا کہ چھلانگ لگانے کے دوران گولی کی زد میں نہیں آئے گا۔ پھر اسے چھپ کر مورچا بنانے کا موقع مل جائے گا۔

اس نے یہی کیا۔ اچانک ہی مہمانوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کہیں سے فائرنگ کی آواز سنائی نہیں دی لیکن اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ کمر کے پاس ریڑھ کی ہڈی ترخ گئی تھی۔ وہ چھلانگ لگاتے ہی اوندھے منہ گر پڑا۔

تمام مہمان گھبرا کر دور ہٹ گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انسپکٹر اوندھے منہ کیسے گر گیا؟

اس نے شدید تکلیف کے باوجود فرش پر سے اٹھنے کی کوشش کی، سر اٹھایا۔ اسی لمحے اس کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا اور تیزی سے لہو اُبل پڑا۔

تمام مہمان دہشت زدہ ہو کر چیختے چلاتے بھاگنے لگے۔ مردہ انسپکٹر کے پاس کئی سپاہی آ گئے۔ باقی سپاہی اور مسلح گارڈز قاتل کو ڈھونڈنے لگے اور مہمانوں کو تسلیاں دینے لگے کہ اب گولی نہیں چلے گی۔ انہیں نقصان نہیں پہنچے گا۔

انسپکٹر کا بہنوئی اور دو سالے مہمانوں کو تاڑ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، قاتل ان کے درمیان ہوگا۔ اسی وقت بہنوئی کو کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے فون۔ کان سے لگایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”بھتا لینے والا انسپکٹر تیرا سالا تھا۔ سالا تو گیا لیکن تماشا ابھی باقی ہے۔“

اس نے غصے سے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”تم تینوں کی طرح ہم بھی تین ہیں۔ تم بھی بہروپیے ہم بھی بہروپیے۔ تم بھی وردی میں ہو، ہم بھی وردی میں ہیں۔ پہچان سکو تو پہچان لو۔“

وہ چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے سیکیورٹی گارڈز کو دیکھنے لگا۔ سب ہی ایک جیسی وردی میں تھے۔ وہ چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ قاتل تین ہیں اور گارڈز کی وردی میں ہیں۔ لیکن منہ کھول کر کچھ کہہ نہ سکا۔ ایک خاموش گولی کھلے منہ میں گھس کر دوسری طرف سے نکل گئی۔ وہ گر کر تڑپنے لگا۔ اس نے گولی چلانے والے کو دیکھ لیا تھا۔ پہچان لیا تھا لیکن بولنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

سپاہی اسے اٹھا کر ایمبولینس کی طرف لے جا رہے تھے۔ اس نے ایمبولینس میں پہنچ کر اشارے سے کاغذ اور قلم مانگا۔ فوراً ہی دونوں چیزیں مہیا کی گئیں۔ اس نے لکھا۔ ”وی لائن آف اللہ بریگیڈ کا اکبر علی سیستانی...!“

وہ آگے نہ لکھ سکا۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ تقریب ہنگامے کی نذر ہو گئی تھی۔

وہاں دو شکار رہ گئے تھے۔ انہوں نے فون کالز سنیں۔ اُن سے کہا گیا کہ انہوں نے یاقوت کے گھر میں گھس کر اس کی بہن کے ساتھ حیوانیت کا جو مظاہرہ کیا تھا، اس کی سزا انہیں موت کی صورت میں مل رہی ہے۔

ان دونوں پر بھی گولیاں چلائی گئیں۔ ان میں سے ایک وہیں مر گیا۔ دوسرا زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بھی کسی دن، کسی وقت مارا جانے والا تھا۔

انہیں وہاں کی کسی عدالت سے بھی سزا نہ ملتی مگر یاقوت کی قدر کرنے والوں نے اس سے کام لینے والوں نے اُن مجرموں کو سزا دی تھی۔ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

☆☆☆

وہ روپوش رہنے کے ایک بہت سخت اور خطرناک مرحلے سے گزر گیا تھا۔ سیکیورٹی افسر اور گارڈز سارہ کے بیڈ روم، باتھ روم اور اسٹور روم میں آ کر دیکھ چکے تھے اور آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھوں کی طرح اسے دیکھ نہیں پائے تھے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ محل کے کسی حصے میں نہیں ہے۔

سارہ نے اپنی خواب گاہ کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اب کوئی وسیم کو دوبارہ ڈھونڈنے کے لیے وہاں نہیں آتا۔ اگر آتا تو وہ پھر آسانی سے اسٹور روم میں جا کر چھپ جاتا۔ وہ دونوں محتاط تھے۔ بیڈ روم میں رہ کر باتیں نہیں کرتے تھے۔ اشاروں کی زبان میں بولتے اور سمجھنے کی کوششیں کرتے تھے۔ جب دشواری ہوتی تو باتھ روم میں آ کر بہت دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے مدعا بیان کر دیتے۔

وسیم نے کہا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے، میں آج رات ہی کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔“

”اگر نہ نکل پائے تو یہاں رہنا ہوگا۔ دل سے خوف نکال دو۔ خدا کا شکر ادا کرو۔“

”بے شک! خدا نے مجھے تمہارے باپ کے شرمناک ظلم سے بچایا ہے۔“

لفظ شرمناک پر سارہ کی گردن جھک گئی۔ اس نے لمحاتی تصور میں یہ جھلک دیکھ لی کہ باپ کیسی بدکاری کا مرتکب ہونے والا تھا اور وہ وسیم کی معصومیت اور شرافت دیکھ رہی تھی۔ اس نے اب تک اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا جبکہ وہ صرف حسین اور جوان ہی نہیں تھی، بلا کی پُرکشش بھی تھی۔

وہ اسے شرمندہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہاں صبر اور حوصلے سے رہو۔ جب یہ اطمینان ہے کہ پکڑے نہیں جاؤ گے تو پھر بھاگنا کیوں چاہتے ہو؟“

''میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا؟''
''اس وقت تک رہ سکتے ہو جب تک آسانی سے فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔''
''ہاں۔تب تک صبر کرنا چاہیے۔مگر سسٹر بہت یاد آ رہی ہیں۔جی کرتا ہے ابھی اڑ کر چلا جاؤں۔''
''تم کہہ رہے تھے وہ تمہاری بہن نہیں ہے؟''
''ہاں۔وہ بہن نہیں ہیں مگر میری سب کچھ ہیں۔''
''سب کچھ کا مطلب کیا ہوا؟''
وہ سوچتے ہوئے بولا۔''میری سمجھ میں نہیں آتا۔میں ٹھیک طرح کہہ نہیں سکتا۔پہلے ان کے قریب رہتا تھا تو کچھ نہیں ہوتا تھا۔مگر اب اُن کو چھوتے ہی اُن سے لپٹ جانے کو جی چاہتا ہے۔''
''اچھا...تو تم ان سے لپٹ جاتے ہو؟''
''ایک بار ایسا ہوا تھا۔میں لپٹ گیا مگر انہوں نے ہٹا دیا۔مجھ سے الگ ہو گئیں۔''
پھر وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔''مجھے بہت یاد آتی ہیں۔اُن سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔''
سارہ نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔''تمہیں کوئی دوسری لڑکی سسٹر جیسی نہیں لگتی؟''
''ان کے سامنے کوئی نہیں جچتی۔''
''اب تو وہ سامنے نہیں ہیں۔ایسے میں کوئی جچتی ہے؟''
''پتا نہیں۔کسی کو دیکھوں گا تو سمجھوں گا۔ان کی غیر موجودگی میں میرا ابھی کسی لڑکی سے سامنا نہیں ہوا...''
وہ کہتے کہتے ٹھٹک گیا۔سارہ کو ایسے چونک کر دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اس کی موجودگی کو سمجھ رہا ہو۔وہ کسی قدر حیرانی سے بولا۔''ہاں، تم تو لڑکی ہو۔''
وہ گھور کر بولی۔''کیا مطلب ہے؟ اب تک تم کیا سمجھ رہے تھے؟''
وہ اسے دیکھ رہا تھا اور الجھ رہا تھا۔پھر اس نے کہا۔''تم اتنی دیر سے میرے ساتھ ہو۔مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ کوئی لڑکی ہے۔بس یہی دیکھ رہا تھا کہ تم ہو۔چاہے کوئی بھی ہو، میری ایک ہمدرد اور مددگار ہو۔''
''تم دیوانے ہو۔تمہارے دماغ میں سسٹر گھسی ہوئی ہے۔اسی کو سوچتے رہتے ہو۔کوئی دوسری تمہیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔''
''تم درست کہہ رہی ہو۔یہی بات ہے۔''
''اب میں تمہیں دکھائی دے رہی ہوں یا نہیں؟''
وہ سر ہلا کر بولا۔''ہاں۔اب سمجھ رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔''
''دیکھ رہے ہو تو کچھ بولو...کیسی لگ رہی ہوں؟''
''بہت اچھی لگ رہی ہو۔''
''صرف اچھی...؟ آگے بولو۔''
''کیا بولوں...؟''
''تم نے سسٹر کو کبھی تو کہا ہو گا کہ وہ بہت حسین ہے؟''
''میں نے کبھی نہیں کہا۔جب وہ حسین ہیں تو کہنے کی ضرورت کیا ہے؟ انہیں معلوم ہو گا۔وہ آئینہ دیکھتی ہوں گی۔''
سارہ نے سمجھ لیا کہ وہ عاشقانہ اور شاعرانہ مزاج کا حامل نہیں ہے۔ایک سیدھا سادہ سا لڑکا ہے۔وہ اس کے قریب آئی۔دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر بولی۔''اب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔تمہاری سادگی اور شرافت متاثر کر رہی ہے۔میں تمہارے کام آ رہی ہوں، کیا تم مجھ سے متاثر ہو رہے ہو؟''
''ہاں۔تم بہت اچھی ہو۔کبھی میری ضرورت پڑے گی تو میں بھی تمہارے کام آؤں گا۔''
''تم کیسے سمجھو گے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے؟''
''تم بولو گی تو سمجھ لوں گا۔''
وہ اس کے اور قریب ہو گئی۔چاہتی تھی کہ زبان سے کچھ نہ کہے اور وہ سمجھ لے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔اچانک ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔دونوں نے گھبرا کر خواب گاہ کی طرف دیکھا۔وہ باتھ روم میں تھے۔وسیم فوراً ہی دوسرا دروازہ کھول کر اسٹور میں چلا گیا۔
وہ تیزی سے چلتی ہوئی باتھ روم سے نکل کر خواب گاہ میں آئی پھر دروازے کے پاس آ کر اسے کھولا۔سامنے ماں کھڑی تھی۔وہ اندر آتے ہوئے بولی۔''دروازہ بند کیوں تھا؟''
''یوں ہی۔کیا آپ اعتراض کرنے آئی ہیں؟''
''اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ پہلے کبھی بند نہیں کرتی تھیں۔''
''آپ نہیں جانتیں۔کبھی کوئی خاص موقع ہو تو اندر سے بند کر لیتی ہوں۔''
بیگم داؤد نے چونک کر پوچھا۔''خاص موقع...؟''
''جی ہاں۔آپ بھی ایسے موقع پر اپنا دروازہ اندر سے بند کر لیتی ہیں۔''
''کیا بک رہی ہو؟ کس خاص موقع کی بات کر رہی ہو؟''
''جب آپ خاص قسم کی فلمیں دیکھتی ہیں۔میں سب جانتی ہوں۔نادان بچی نہیں ہوں۔''
وہ جھکتے ہوئے انداز میں بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔''کیا کریں؟ ایسا لگتا ہے اس تاج محل جیسے محل میں ہمیں زندہ دفن کر دیا گیا ہے۔تم بھی یہی کر رہی ہو۔''

اس نے ماں کو ہمدردی سے دیکھا۔ وہ سمجھتی تھی' یہ دیکھتی تھی کہ باپ جب وہاں آتا تھا تو حرم سرا میں راتیں گزارتا تھا۔

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''مام! آئی لو یو۔''

وہ بیٹی کی ٹھوڑی کو چھو کر بولی۔ ''آئی لو یو ٹو... وہ لڑکا بہت یاد آرہا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کس کی بات کررہی ہیں؟''

''وہی جو وسیمہ بن کر آیا تھا۔''

اس نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکا نہیں لڑکی تھی۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''نہیں۔ وہ لڑکا تھا۔''

اس نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو پھر لڑکی بن کر کیوں آیا تھا؟''

بیگم داؤد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ابھی اس بات کی گہرائی میں نہ جاؤ۔ رفتہ رفتہ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ کیا کریں؟ وقت اور حالات بھی کسی راز کو راز نہیں رہنے دیتے۔ یہ بھید آخر تم پر کھلنا ہی ہے۔''

وہ اپنی ماں کی ڈھکی چھپی باتوں کو واضح طور پر سمجھ رہی تھی۔ اگر باپ کا وہ شرمناک روپ اس پر ظاہر نہ ہوتا تو یقیناً اُسے کریدتی۔ ضد کرتی کہ اسے سمجھائے' وہ کس بھید کی بات کررہی ہے؟ ایک لڑکا وہاں لڑکی بن کر کیوں آیا تھا؟ مگر اس نے کچھ نہ پوچھا۔ کوئی سوال نہ کیا۔ نہ جانے کیوں اس بات کے ذکر سے ہی کراہت محسوس ہورہی تھی۔

بیگم داؤد نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں تعجب نہیں ہورہا ہے کہ وہ اچانک کیسے یہاں سے فرار ہوگیا؟ اسے سیکیورٹی گارڈز بھی نہ دیکھ سکے۔''

''میں نے سوچا تھا' پھر یہی بات سمجھ میں آئی کہ اس نے کسی گارڈ کی غفلت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بہرحال، وہ بھاگنا چاہتی... میرا مطلب ہے' بھاگنا چاہتا تھا' بھاگ گیا۔''

''مگر کیسے بھاگ گیا؟ تمہیں اس کا لباس ملا تھا۔ کیا وہ یہاں سے بے لباس گیا ہے؟''

سارہ کو ہنسی آگئی۔ وہ بولی۔ ''تم ہنس رہی ہو؟ ذرا سوچو! وہ گارڈز کی نظروں میں نہیں آیا لیکن جہاں سے بھی گزرا ہوگا' تماشا نہیں بنا ہوگا؟''

''ہوسکتا ہے' اس نے نیکر پہن رکھی ہو۔''

وہ بڑی حسرت سے بولی۔ ''نہ جاتا تو اچھا ہوتا۔ تم نے اسے لڑکے کے اصل روپ میں نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا تھا۔ وہ تو سیدھا دل میں اتر گیا۔''

سارہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ اپنے اس بازو کو سہلا رہی تھی جو ذرا سی دیر کے لیے وسیم کی گرفت میں آیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے معلوم ہوتا کہ وہ بھاگنے والا ہے تو میں اسے جانے نہ دیتی۔''

بیٹی نے اسٹور کی طرف دیکھا۔ وہ وہاں بند تھا...... وہ اپنے اندر کی بات کھل کر نہیں کہہ رہی تھی مگر سارہ سمجھ رہی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ جو دولت مند عیاش کنیزیں پالتے ہیں یا گھر سے باہر داشتہ رکھتے ہیں... بیوی کو گھر کی مرغی سمجھ کر دانہ نہیں ڈالتے، وہ مرغی دانہ چگنے کے لیے دوسری جگہ منہ مارتی ہے۔

وہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ پھر اس کے ساتھ چلتی ہوئی دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''گارڈز نے یہاں پورے علاقے میں اس کے متعلق پوچھ گچھ کی ہے۔ سب نے یہی کہا ہے کہ انہوں نے کسی خوبرو لڑکے کو نہیں دیکھا۔''

وہ دروازے کے قریب آکر بولی۔ ''کتنا عجیب ہوا اور وہ کسی کو نظر نہ آئے... یہ ہو نہیں سکتا۔ میں یقین سے کہتی ہوں' وہ فرار نہیں ہوا ہے۔''

سارہ پریشان ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ''آپ جذباتی طور پر کچھ زیادہ ہی اس لڑکے سے وابستہ ہوگئی ہیں۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے تو پھر کہاں غائب ہوگیا ہے؟''

''یقیناً اسی محل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں ایک ایک کمرے میں جاؤں گی۔ ایک ایک کونے میں اُسے تلاش کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے' وہ ہے... یہیں کہیں ہے۔''

وہ بولتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔ سارہ اسے نظروں سے اوجھل ہونے تک پریشان ہوکر دیکھتی رہی۔ پریشانی یہ نہیں تھی کہ وہ وسیم کو ڈھونڈ نکالے گی بلکہ یہ تھی کہ ماں بھی اسی ایک انار کی بیمار تھی۔ عشق ایسا سچا تھا کہ اسے معشوق کی موجودگی کا یقین دلا رہا تھا۔ جذبۂ عشق نے اُسے تلاشِ یار میں لگا دیا تھا۔

سارہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔ اس ایک انار کے دو نہیں' تین بیمار تھے۔ اس کا باپ بھی اُسے اپنے مقصد کے لیے لایا تھا۔ یہ عجیب سی شرمناک بات تھی۔ ماں' باپ اور بیٹی سب ہی اس کے طلب گار تھے۔

اُس نے باتھ روم میں آکر دروازے پر دستک دی۔

''باہر آجاؤ۔''

وہ باہر آگیا۔ سارہ نے اسے دیکھا تو پہلے سے زیادہ اس کی اہمیت بڑھ گئی۔ وہ خاموش کھڑا رہا پھر بولا۔ ''تم کب تک مجھے دیکھتی رہوگی؟''

وہ محویت سے چونک کر بولی۔ ''مام کو شبہ ہے کہ تم اسی محل میں چھپے ہوئے ہو۔ وہ تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔''

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''کیا وہ اسٹور میں آسکتی ہیں؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''یہاں پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ تم اتنے وزنی سامان کے پیچھے چھپے ہو۔ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔ ہم بیڈ روم میں بھولے سے بھی باتیں نہیں کریں گے۔''

وہ بولا۔ ''میں محتاط رہوں گا۔ اب تو کافی وقت گزر چکا ہے؟ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کیا آٹھ بج چکے ہیں؟''

''نو بج رہے ہیں۔ میں ابھی کھانا لاتی ہوں۔ تم اسٹور روم میں جاؤ۔''

وہ چلا گیا۔ سارہ خواب گاہ سے باہر آئی۔ پھر وہاں سے کچن میں جاکر کھانا گرم کرنے لگی۔ ایسے وقت بیگم داؤد محل کے دوسرے حصے سے بھٹکتی ہوئی سارہ سے پھر ملنے آئی۔ اس نے بیٹی کو آواز دیتے ہوئے دروازے کو کھولا تو وہ کھل گیا۔ بالکل ایسے جیسے راز کھلتا ہے۔

اس نے اندر آکر ہولے سے آواز دی۔ ''کہاں ہو تم؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ وہاں دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازے پر آکر پوچھا۔ ''کیا واش روم میں ہو؟''

اس کی آواز باتھ روم کے اندر گونجتی ہوئی وسیم تک پہنچی۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ صرف اسے سارہ کی آواز سنائی دی۔ یہی سمجھ میں آیا کہ سارہ اسے باہر آنے کو کہہ رہی ہے۔

اس نے کنڈی پر ہاتھ رکھا۔ اسے نیچے کرکے دروازہ کھول کر نکلنا چاہتا تھا... اچانک یاد آیا کہ اس نے پہلے بھی بیگم داؤد کی آواز سن کر دھوکا کھایا تھا اور دروازہ کھول دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی کی آواز اور لہجہ ملتا جلتا ہے۔ اسے اور ایک بار اچھی طرح سننا چاہیے۔

بیگم داؤد باتھ روم میں جھانکنے کے بعد وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ''کہاں ہو؟ آ بھی جاؤ۔''

اس نے صاف طور پر سنا۔ سارہ باہر آنے کو کہہ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر باتھ روم میں آگیا۔ وہاں سارہ نہیں تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا ادھ کھلے دروازے پر آیا پھر ایک دم ٹھہر گیا۔ وہاں بیٹی نہیں تھی' ماں تھی۔

خیریت یہ ہوئی کہ سامنا نہیں ہوا۔ بیگم داؤد کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بیٹی کو نہ پاکر واپس جارہی تھی۔ وسیم فوراً ہی پلٹ کر اسٹور روم کی طرف جانے لگا۔ بدحواسی میں پچھلی بار فلاور اسٹینڈ سے ٹکرا گیا تھا۔ اس وقت تیزی سے چلنے کے باعث چکنے ٹائلز پر پھسل گیا۔

بیگم داؤد دروازے سے باہر جاتے جاتے رک گئی۔ ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی۔ اس نے سر گھما کر باتھ روم کی طرف تعجب سے دیکھا۔ وہاں سے واپس چلتی ہوئی دروازے پر آئی۔ اسے پوری طرح کھول کر دیکھنے لگی۔ باتھ روم پہلے کی طرح خالی تھا۔

وہ بیگم داؤد کے پلٹ کر آنے سے پہلے ہی اٹھ کر دوڑتا ہوا اسٹور روم میں آکر بند ہوگیا۔ وہ حیرانی سے سوچ رہی تھی' کیا آواز باتھ روم سے آئی تھی؟ اس نے اندر آکر اسٹور روم کے دروازے کو ذرا دھکا مار کر دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دوسری طرف سے بند تھا۔

وہ جانتی تھی' اسٹور روم میں بھاری بھرکم سامان ہے۔ کوئی انہیں ہٹا کر دوسرے بند دروازے کی طرف آ نہیں سکتا۔ وہ واپس جاتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'کوئی آواز نہیں تھی... وہم تھا۔'

وہ باتھ روم کے دروازے سے نکلی تو اُدھر سے سارہ ایک ٹرالی میں کھانا لے کر آئی۔ ماں کو باتھ روم سے نکلتے دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔ ''آپ میرے کمرے میں... یہاں باتھ روم میں کیا کررہی ہیں؟ کیا میں نے اس لڑکے کو یہاں چھپا رکھا ہے؟ آپ مجھ پر شبہ کیوں کررہی ہیں؟''

''سارہ! یہ بات نہیں ہے۔ میں تو تم سے ایک بات کہنے آئی تھی۔''

''کوئی بات کہنے نہیں' جاسوسی کرنے آئی تھیں۔ آپ کے دماغ میں خناس بھرا ہے۔ وہ لڑکا آپ کے دماغ میں گھس گیا ہے۔ آپ اس کے لیے پاگل ہورہی ہیں۔''

''ہاں پاگل ہورہی ہوں۔ وہ اسی محل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ ابھی یہ کہنے آئی تھی کہ تمہارے کزن کی اٹیچی سے اس کے کپڑے غائب ہیں۔''

وہ کپڑے سارہ لے آئی تھی۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''غائب ہیں تو میں کیا کروں؟''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اس نے کپڑے پہن لیے ہیں۔''

''تو میں کیا کروں؟ آپ جاکر اُتار دیں مگر یہاں سے جائیں۔ آئندہ میری اجازت کے بغیر کمرے میں قدم نہیں رکھیں گی۔ اب میں باہر جاؤں گی تو ہمیشہ دروازے کو بند رکھوں گی۔''

بیگم داؤد غصے سے بولی۔ ''جارہی ہوں۔ مجھے تمہارے کمرے میں آنے کا شوق نہیں ہے۔ توبہ ہے۔ ایسے چیخ رہی ہو جیسے تمہاری دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہو۔ کسی چور کی داڑھی میں تنکا ہوگا تو وہ بھی ایسے نہیں چیخے گا۔''

وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''اتنا تو یقین ہوگیا ہے

کہ وہ یہاں ہے۔ آج اُس نے کپڑے چرائے ہیں۔ کل تک بھوکا پیاسا رہے گا تو کھانا چرانے کچن میں ضرور آئے گا۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ بیٹی کو باتیں سنانے کی دُھن میں ٹرالی کی طرف دھیان نہیں دیا کہ وہ کھانا ایک آدمی کی ضرورت سے زیادہ ہے۔ سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر تیزی سے باتھ روم میں آکر دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "باہر آؤ۔"

وہ باتھ روم میں آیا۔ سارہ نے پوچھا۔ "کیا تمہیں معلوم ہے مام یہاں باتھ روم میں آئی تھیں؟"

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا 'کہاں ہو؟ آ بھی جاؤ...' اور میں دروازہ کھول کر نکل آیا تھا۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر چیخ پڑی۔ "کیا...؟"

"مگر انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ باہر جا رہی تھیں۔"

وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "تم نے دروازہ کیوں کھولا؟"

"میں کیا کروں؟ ان کی اور تمہاری آوازیں بہت ملتی ہیں۔"

سارہ نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ "کیا مصیبت ہے؟"

وسیم بتا رہا تھا کہ وہ باتھ روم میں پھسل گیا تھا۔ وہ شاید پلٹ کر آئی تھیں۔ اسٹور روم کے دروازے کو دھکا مار کر کھولنا چاہا تھا لیکن وہ دم سادھے کھڑا رہا تھا۔ منہ سے آواز نہیں نکالی تھی۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "مام پرابلم بن رہی ہیں۔ تم بھی ذرا سی بات پر بوکھلا جاتے ہو۔ سنبھل کر چلنا بھول گئے ہو اسی لیے پھسل گئے۔"

"اسی لیے کہتا ہوں' مجھے یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

"تم ابھی یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔ محل کے اندر اور باہر خفیہ کیمرے لگے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈز ایک کمرے میں بیٹھے مختلف ٹی وی اسکرین پر دیکھتے رہتے ہیں۔"

"پھر تو وہ ہمیں دیکھ رہے ہوں گے۔"

"نہیں۔ میرے اور مام کے کمروں میں خفیہ کیمرے نہیں ہیں۔"

"تم نے کہا تھا' میں رات کو یہاں سے نکل سکوں گا؟"

"ہاں۔ کبھی کبھی دھماکے ہوتے ہیں۔ بجلی منقطع ہو جاتی ہے' تب نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے چھت پر جا کر جائزہ لینا ہوگا کہ گارڈز کہاں کہاں پہرا دے رہے ہیں اور ایسی کون سی جگہ ہے' جہاں کوئی پہرے دار نہیں ہے۔ اسی راستے سے بھاگنے کا موقع ملے گا۔"

"جب بجلی جائے گی' تاریکی چھا جائے گی تو یہ کیسے نظر آئے گا کہ گارڈز کہاں ہیں اور کہاں نہیں ہیں؟"

"ہاں۔ نظر نہیں آئے گا۔ بڑی دشواریاں ہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں' جلدی نہ کرو۔ کبھی نہ کبھی دن کو یہاں سے نکلنے کا موقع مل سکے گا۔"

وہ دونوں خواب گاہ میں آگئے اور کھانا کھانے لگے۔ کوئی ضروری بات کہنے کے لیے نہیں تھی اس لیے چپ چاپ کھاتے رہے اور اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ وہاں سونے کے لیے ایک بیڈ تھا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ چار افراد آسانی سے سو سکتے تھے۔ وسیم نے اشارے سے کہا۔ "میں قالین پر سو جاؤں گا۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر ہاتھ کے اشارے سے بولی۔ "تم بیڈ کے اس سرے پر سو سکتے ہو۔ میں اس سرے پر سو جاؤں گی۔"

وہ بیڈ کے ایک کونے پر لیٹ گیا۔ اسے یاقوت یاد آرہی تھی۔ وہ تو قریب آکر لیٹ جاتی تھی مگر فاصلہ بھی رکھتی تھی۔

سارہ نے ہلکی سبز روشنی آن کی۔ باقی تمام لائٹس بجھا دیں۔ اب وہ زیرو پاور کی مدھم روشنی میں سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے اسکارف اور کوٹ اتار دیا۔ وہ کم سے کم لباس میں ہلکی پھلکی سی ہو کر سونے کی عادی تھی۔ وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر آگئی۔ اسے لیٹنا چاہیے تھا لیکن دو زانو ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھائے پھر ایک بھرپور انگڑائی لی۔

وسیم نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ انگڑائی کی اٹھان قیامت کو پکار رہی تھی۔ کمر خمیدہ ہوگئی۔ دونوں بازو حلقہ بنا کر کہہ رہے تھے' پھندا تیار ہے۔

نیم تاریکی اور مدھم سی روشنی میں بدن کے تمام خطوط الگ الگ نمایاں ہو گئے تھے۔

وہ لیٹا ہوا تھا' اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سارہ کی صورت واضح نہیں تھی۔ وہ کوئی بھی ہو سکتی تھی... اور وہ سسٹر ہی لگ رہی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ شاید انگڑائی لینے والی زیادہ خم کھا گئی تھی۔ دھپ سے اس کے قریب بستر پر گر پڑی۔ ایسا ہی لگا جیسے چکرا کر چاروں شانے چت ہو گئی ہے۔

کیا کرنے کا انداز تھا؟ وہ گم صم سا اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے گری تھی اسی حالت میں پڑی رہ گئی تھی۔ ایسے ساکت تھی جیسے پہلو میں آکر ختم ہو گئی ہو۔

وہ جھک کر اسے آواز دینا چاہتا تھا۔ "اے! کیا ہوا؟ ٹھیک تو ہو؟ اٹھتی کیوں نہیں ہو؟"

وہ بول نہ سکا۔ خواب گاہ میں بولنے کی ممانعت تھی۔ آواز باہر جا سکتی تھی۔ وہ ذرا اور قریب ہو کر کان کے قریب

منہ لے جا کر بہت ہی دھیمی سرگوشی میں بولا۔ "اے! کیا ہوا ہے تمہیں؟ کچھ اشارے سے بتاؤ۔"

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا' اس کے اندر سے جان نکل گئی ہے۔ اب کبھی نہیں اٹھے گی۔

ایسے ہی وقت اتفاق سے بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ مضطرب ہو کر سوچنے لگا۔ 'وہ دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کیسے معلوم کروں' کس حال میں ہے؟ میں خود کو دیکھ نہیں پا رہا ہوں... مگر میں ہوں اور وہ کہاں ہے؟'

اس نے خود کو سمجھایا 'نہیں۔' وہ نابود نہیں ہوئی ہے۔ وہیں اس کے پاس ہے۔ ابھی چھونے سے معلوم ہو جائے گا کہ ہے یا نہیں ہے؟'

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اندھے کا ہاتھ کہیں بھی پہنچ جاتا ہے۔ جہاں پہنچا' وہاں دھک دھک ہو رہی تھی۔ وہ دھک دھک پوچھ رہی تھی۔ "آ گئے...؟"

اس کا ہاتھ وہیں تھم گیا۔ اسے یاد آیا' جدائی کی رات اس نے سسٹر کی دھڑکنوں پر سر رکھا تھا اور وہ سسٹر ہی لگ رہی تھی۔ دھڑکنوں کا کوئی نام، کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بس ایک کشش ہوتی ہے۔ تاریکی میں صورتیں نظر نہیں آتیں۔ صرف جذبے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہوتے ہیں۔

اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے کب وہاں سر رکھ دیا تھا؟ عجب سا سحر طاری تھا۔ اس کا ہاتھ جہاں جہاں جا رہا تھا وہاں وہاں اس کی آئیڈیل سلگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔"

باہر اس علاقے میں کہیں بم بلاسٹ ہوا تھا۔ دھماکے سے در و دیوار لرز گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے تڑخ گئے تھے۔ بیگم داؤد دھماکے کے باعث لرز گئی تھی۔ اٹھ کر ٹہل رہی تھی۔ اسے وسیم کی فکر تھی کہ وہ تاریکی میں دھماکے سے سہم گیا ہوگا۔ گھبرا کر جائے پناہ سے نکل آیا ہوگا۔ ایسے وقت آسانی سے ہاتھ آجائے گا۔

وہ ایمرجنسی لائٹ اٹھا کر کمرے سے باہر آگئی۔ رات کا ایک بجا تھا۔ یہ خیال بھی ستا رہا تھا کہ بے چارہ بھوکا ہوگا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لائے گی۔ بھوک مٹائے گی۔ اسے پھر کبھی کمرے سے نکلنے نہیں دے گی۔

وہ محل اس قدر وسیع و عریض تھا کہ وہ ایک دن میں وہاں کے ایک ایک گوشے کی تلاشی نہیں لے سکتی تھی۔ وہ دن کے وقت کئی کمروں اور اسٹور روم میں گئی تھی مگر مطمئن نہیں تھی۔ اس وقت بجلی نہیں تھی۔ اگر وسیم کو ڈھونڈ نکالتی تو گارڈز اسے دیکھ نہ پاتے۔ وہ دعائیں مانگ رہی تھی کہ وہ تاریکی میں مل جائے اور رازداری سے من کی مرادیں پوری ہو جائیں۔

وہ بیٹی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے وقت رک گئی۔ ایمرجنسی لائٹ بجھا دی۔ جب بجلی جاتی تھی' سارہ فوراً ہی اپنے کمرے کی لائٹ آن کر لیتی تھی۔ اگر وہ لائٹ اس وقت آن ہوتی تو بند دروازے کے نچلے حصے سے روشنی ضرور جھلکتی جبکہ نہیں جھلک رہی تھی۔

وہ حیران تھی۔ بیٹی کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی؟ اسے اندھیرے میں ڈر نہیں لگ رہا تھا؟ ماں کا تجربہ کہہ رہا تھا۔ ڈرپوک لڑکیوں کو بس ایک ہی مرحلے میں تاریکی سے ڈر نہیں لگتا۔ سارہ کو ڈر کیوں نہیں لگ رہا ہے؟

وہ بند دروازہ اور اس کے پیچھے گھپ اندھیرا سوالیہ نشان بن گئے تھے۔

وہ دبے قدموں چلتی ہوئی دروازے سے آکر لگ گئی۔ اسی وقت اس کی انگوٹھی دروازے سے ٹکرا گئی۔ ہلکی سی کھٹ کی آواز ابھر کر معدوم ہو گئی۔ وہ کان لگا کر سننے لگی۔ اندر پُراسرار خاموشی تھی۔ اسے یہ ماننا پڑا کہ بیٹی سو رہی ہے۔ سونے کے دوران بجلی گئی ہے اس لیے نہ اس نے تاریکی دیکھی ہے' نہ خوف زدہ ہوئی ہے۔

وہ ایمرجنسی لائٹ آن کر کے اپنے یار دلدار' نوخیز لڑکے کو تلاش کرنے آگے بڑھ گئی۔

سارہ اور وسیم نے دروازے پر ہلکی سی کھٹ کی آواز سنی تھی۔ پھر دونوں نے دم سادھ لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دروازے کے نچلے حصے سے ایمرجنسی لائٹ کی جھلک دیکھی۔ وہ روشنی دور ہوتی ہوئی معدوم ہو گئی۔ یہ یقین ہو گیا کہ وہ جا چکی ہے۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔ وہ دونوں پھر آزاد ہو گئے۔ سارہ کروٹ لے کر اس سے چپک گئی۔ اتنی دیر میں وہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ آگے بھی پیار کے جذباتی مراحل سے گزرنا تھا لیکن وسیم پیچھے ہٹ گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سارہ نے حیرانی سے سوچا۔ 'یہ کیوں الگ ہو گیا ہے؟'

وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ پھر وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وسیم نے کان میں سرگوشی کی۔ "باتھ روم میں چلو۔"

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیڈ سے اتر گئے۔ موبائل فون کی مدھم سی روشنی میں چلتے ہوئے باتھ روم میں آئے۔ سارہ نے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اس سے لگ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"
"میں... میں اُلجھن میں ہوں۔"
"کیا میں تمہاری سسٹر جیسی نہیں ہوں؟ اس کے پاس جانا چاہتے ہو؟"
اس نے فوراً ہی اسے بازوؤں میں سمیٹ کر کہا۔ "تمہیں پا کر یہ عقل آئی ہے کہ میں سائے کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سسٹر کسی مجاہد حارث کو چاہتی ہیں۔ میں ایک بچے کی طرح زبردستی ان کی توجہ چاہتا تھا۔"
وہ خوش ہو کر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو۔ اب دانائی سے سوچ رہے ہو۔"
"میں نہیں جانتا تھا' عورت کیا ہوتی ہے؟ پہلے سسٹر کو چھو کر سمجھا۔ اب تمہیں پا کر سمجھ رہا ہوں۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"
وہ گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "اور بولو..."
"میں یہاں سے جاؤں گا تو تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گا۔"
"میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ رہو گے۔"
"کیسے رہوں گا؟ یہاں کب تک چھپا رہوں گا؟"
"جب تک حالات سازگار نہیں ہوں گے' تمہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ جب بھی موقع ملے گا' میں تمہیں نکال لوں گی۔"
"میں جہاں بھی جاؤں گا' تمہارے لیے تڑپتا رہوں گا۔ کیا تم مجھے بھول جاؤ گی؟"
"مرتے دم تک نہیں بھولوں گی' نہ تمہیں چھوڑوں گی۔ میرے دو فون نمبرز تمہارے پاس رہیں گے۔ تم سے بچھڑتے ہی میں لندن جاؤں گی۔ وہاں تمہیں بلاؤں گی۔ تم جب تک یہاں رہو گے' ہم اس سلسلے میں پلاننگ کریں گے۔"
"میں یہاں سے جانے کی جلدی نہیں کروں گا لیکن ایک اہم بات ہے۔"
"وہ کیا؟"
اس نے کہا۔ "خدا نے مجھے گناہوں کی دلدل میں جانے سے بچا لیا ہے۔ میں آئندہ بھی گناہوں سے دامن بچاتا رہوں گا۔ تمہارے ساتھ بھی ناجائز تعلق نہیں رکھوں گا۔"
اس نے تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اسے پا لینے کے لیے اس کے وجود میں اور زیادہ جذب ہونے لگی۔ پھر وہ بولی۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ہم ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی کمرے میں ایک دوسرے کے بغیر کیسے رہیں گے؟"
"ہاں۔ میں نہیں رہ سکوں گا۔ تمہیں ہمیشہ آغوش میں بھر کر رکھنا چاہتا ہوں مگر گناہ نہیں کروں گا۔"

"میں تمہاری منکوحہ بن سکتی ہوں۔ کیا ہم قاضی اور گواہوں کے بغیر ایک دوسرے کے نکاح میں نہیں آ سکتے؟"
"میں نہیں جانتا۔"
"میں جانتی ہوں۔ دل میں خوفِ خدا ہو اور دو چاہنے والے پورے ایمان سے ایک دوسرے کو قبول کریں' آئندہ ایک دوسرے کو فریب نہ دیں۔ خدا کو حاضر جان کر قبول کیے ہوئے رشتے کو نہ توڑیں تو وہ ایک دوسرے کے لیے محرم ہو سکتے ہیں۔"
"میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ ہم ابھی غسل کریں گے۔ پاک و صاف ہو کر کلمہ پڑھیں گے اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک دوسرے کو ساری زندگی کے لیے قبول کر لیں گے۔"
انہوں نے فوراً ہی غسل کی تیاری کی۔ سارہ نے اپنے کزن کے لائے ہوئے کپڑوں میں سے دوسرا جوڑا نکال کر اسے دیا۔ انہوں نے ایمرجنسی لائٹ آن کر لی تھی۔ پہلے وسیم نے غسل کیا پھر سارہ غسل کرنے کے بعد ایک نیا پہن کر کمرے میں آ گئی۔
ایسے وقت بیگم داؤد اپنے جذباتی مسیحا کو تلاش کرنے کے بعد مایوس ہو کر ادھر آئی تو بند دروازے کے نچلے حصے سے روشنی کی جھلک دیکھ کر رک گئی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے وہاں گہری تاریکی تھی۔ اس نے سوچا۔ 'اس وقت سارہ سو رہی تھی۔ تاریکی سے خوف زدہ نہیں تھی۔ اب جاگ رہی ہے' تب ہی اندر روشنی ہے۔'
اسی وقت بجلی آ گئی۔ سارا محل جگمگا اٹھا ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ سارہ اور وسیم نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ وہ اسٹور روم کی طرف جانا چاہتا تھا۔ سارہ نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اشارے سے کہا۔ "رک جاؤ۔"
وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔ بہت خوش تھے۔ اسی وقت کباب میں ہڈی بن کر آ گئی بیگم داؤد نے دوسری بار دستک دیتے ہوئے کہا۔ "سارہ! میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔"
وہ جھنجلا کر بولی۔ "واٹ نان سنس... کیوں اتنی رات کو آئی ہیں؟ کیوں میری نیند خراب کر رہی ہیں؟"
"تم جاگ رہی ہو۔ میں نے تمہیں نہیں جگایا۔"
"یا خدا! آپ کیوں آئی ہیں؟"
"ایک بات کرنی ہے پھر چلی جاؤں گی۔"
"تو کریں۔ میں سن رہی ہوں۔"
"دروازہ تو کھولو۔ کیا پردے میں رہ کر سنو گی؟"
اس نے وسیم کو جانے کا اشارہ کیا پھر کہا۔ "ذرا ٹائم دیکھیں۔ یہ باتیں کرنے کا نہیں' سونے کا وقت ہے۔ آپ

جائیں۔ صبح بات ہو گی۔"
"ابھی نہیں کہوں گی تو پیٹ میں درد ہو گا۔ میری بیٹی! میری جان! دروازہ کھولو۔"
اس نے جھنجلا کر سوچا۔ 'یہ بات کیے بغیر پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔'
اس نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ اندازہ کیا کہ وہ اسٹور روم میں جا کر چھپ گیا ہے۔ تب وہ دروازہ کھول کر غصے سے بولی۔ "آپ کیوں پریشان کر رہی ہیں؟"
اس نے بیٹی کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اتنی رات کو غسل کیا ہے؟"
وہ اپنی بھیگی زلفوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ تو کیا ہوا؟ یہ کوئی انوکھی بات ہے؟"
وہ کمرے میں ہر طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ بستر کی چادر پر اتنی زیادہ شکنیں پڑی تھیں جیسے وہاں خوب دھینگا مشتی ہوئی ہو۔ سارہ نے بھی ادھر دیکھا تو اسے غلطی کا احساس ہوا۔ پہلے بستر کی چادر کو درست کرنا تھا مگر وہ بھول گئی تھی۔
ماں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا تم پورے بیڈ پر ناچتی رہی ہو؟"
وہ ڈھٹائی سے بولی۔ "ہاں۔ ایم پی تھری پلیئر سے اُم کلثوم کو سن رہی تھی اور ناچ رہی تھی۔"
"تم تو سو رہی تھیں؟"
"ناچتے ناچتے تھک کر سو گئی تھی۔ جتنے بھی سوالات ہیں' جلدی جلدی پوچھیں اور یہاں سے جائیں۔"
وہ جیسے یاد کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔ میں یہ کہنے آئی ہوں کہ وہ لڑکا یہاں کے خفیہ کیمروں کے متعلق نہیں جانتا۔ پتا نہیں کہاں چھپا ہے؟ اگر بھوک پیاس سے مجبور ہو کر وہاں نکلے گا تو سیکیورٹی گارڈز اسے اپنے مانیٹرز پر دیکھ لیں گے۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ بے چارہ پکڑا جائے گا۔"
وہ بیزاری سے بولی۔ "مام! وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ کے دماغ میں گھسا ہوا ہے۔ اُسے نکالیں اور جا کر آرام سے سو جائیں۔"
اس نے ماں کو پکڑ کر اس کا رخ دروازے کی طرف کیا۔ وہ کمرے سے باہر جا کر بولی۔ "میرا دل کہتا ہے' وہ یہیں چھپا ہوا ہے۔ میں صبح تک اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔"
"مام! خدا کا واسطہ ہے' اسے بھول جائیں۔"
سارہ نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا مگر وہیں کھڑی رہی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ ماں آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے دروازے کے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ وہ نظر آ رہی تھی۔ وہاں سے جاتے جاتے رک گئی۔ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
بیگم داؤد کو ان لحات میں بستر کی شکنیں یاد آ رہی تھیں پھر بیٹی نے اتنی رات کو غسل کیا تھا۔ ان دونوں باتوں کا تعلق اس کے دماغ میں چبھ رہا تھا۔
پھر یہ یاد آیا کہ وہ اندھیرے سے ڈرتی ہے جبکہ غسل کرنے سے پہلے اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا پھر وہ خوف زدہ کیوں نہیں تھی؟
یہ بات تو موٹی سی عقل میں بھی آ جاتی ہے کہ کوئی جذبات کا چراغاں کرنے والا ہو تو لڑکی اندھیرے سے ڈرنا بھول جاتی ہے۔
بیگم داؤد سوچتے ہوئے دروازے کی طرف آنے لگی۔ وہ کی ہول سے دکھائی دے رہی تھی۔ قریب آتے آتے ایک طرف ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ سارہ کی ہول سے ہٹ کر پھر دستک کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن دوسری طرف خاموشی رہی۔
وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ 'کیا مصیبت ہے؟ مام دستک کیوں نہیں دے رہیں۔ شاید دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔'
اس نے فرش کی طرف دیکھا اور جھک کر فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اُدھر بیگم داؤد نے سوچا۔ 'دروازے کے نچلے حصے سے وہ نظر آ سکتی ہے۔ دیکھوں تو' کیا کر رہی ہے؟'
وہ بھی جھک کر فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اپنے چہرے کو ٹھنڈے فرش سے لگا دیا۔ اُدھر سارہ نے اپنے چہرے کو قالین پر رکھ کر دیکھا تو ماں کی ایک آنکھ دکھائی دی۔
اُدھر سے ماں نے چونک کر دیکھا۔ بیٹی کی ایک آنکھ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دروازے کے نچلے حصے سے ہی پھٹ پڑی۔ "مام! آپ کو شرم آنی چاہیے۔ کیا بیٹی کے کمرے میں اس طرح جھانکتے ہیں؟"
وہ بولی۔ "زیادہ نہ بولو۔ میں ماں ہوں۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرو گی تو جاسوسی کروں گی۔"
"میں نے کیا الٹی سیدھی حرکتیں کی ہیں؟"
"پہلے تم اندھیرے میں ڈرتی تھیں' اب نہیں ڈرتیں۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ میری ایسی حرکت سے آپ کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے؟"
"تمہارا باپ سنے گا تو اسے بھی تکلیف پہنچے گی۔ وہ تمہیں گولی مارنے سے پہلے یہ نہیں کہے گا کہ جوان لڑکی کو تاریکی میں کب ڈر نہیں لگتا؟"
"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"تم خوب سمجھ رہی ہو۔ پہلے تو تمہیں اندھیرے میں ڈر نہیں لگا۔ پھر لائٹ آتے ہی غسل کیا... اور کیوں کیا؟ یہ بستر کی شکنیں اب بھی بول رہی ہیں۔ ذرا سر گھما کر دیکھو۔"

وہ بری طرح گھبرا گئی۔ چوری پکڑی گئی تھی۔ اس نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ "آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ کیا میں نے یہاں کسی کو چھپا کر رکھا ہے؟"

"میں کیا جانوں، تم کیا کر رہی ہو؟ زمین پر رکھے رکھے گردن دُکھنے لگی ہے۔ دروازہ تو کھولو۔"

وہ اٹھ کر دروازہ کھول کر بولی۔ "اندر آئیں اور اچھی طرح دیکھیں۔ میں نے یہاں کس کو چھپا رکھا ہے؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ تیزی سے چلتی ہوئی واش روم گئی۔ سارہ نے وہاں آکر وسیم کو موجودہ صورتِ حال سمجھانے کو تیز آواز میں کہا۔ "آپ ماں ہو کر بیٹی پر شبہ کر رہی ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "میں نے یہاں ایک ہلکی سی آواز سنی تھی۔"

وسیم ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹے پہلے باتھ روم میں پھسل کر گرا تھا۔ وہ خاتون اب انکوائری کرنے آئی تھی۔ اس نے اسٹور روم میں کھلنے والے دروازے کو دھکا مارتے ہوئے یقین کیا کہ وہ ہمیشہ اندر کی طرف سے بند رہتا ہے۔

سارہ نے کہا۔ "اگر آپ کی تسلی ہو گئی ہو تو اسٹور روم میں چلیں؟"

یوں اس نے وسیم کو یہ سمجھا دیا کہ ماں اب اسٹور روم میں آ رہی ہے۔

بیگم داؤد باتھ روم سے نکل کر کمرے میں آئی۔ اس نے قالین پر اوندھے منہ لیٹ کر بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ اسٹور روم میں بھی وزنی سامان کا ذخیرہ تھا۔ مایوس ہو کر اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔

سارہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ بڑے کرب سے بولی۔ "میں کیا کروں؟ وہ میرے اندر سے نہیں نکل رہا اس لیے تم پر شبہ کر رہی تھی۔"

وہ ماں کو تھپکتے ہوئے بولی۔ "اب تو شبہ دور ہو گیا؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "تم نہیں جانتیں... ایک سہاگن اگر بیوہ بن کر زندگی گزارے، کبھی کوئی مرد اس کی تنہائی میں نہ آئے تو وہ اندر سے کیسے سلگتی ہے؟ میں زندہ جل رہی ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس نے ماں کو بڑی ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ پھر اس سے لپٹ کر بولی۔ "مام! میں سمجھ رہی ہوں۔ آپ بہت مظلوم ہیں۔ میں آپ سے کہتی ہوں، پاپا سے طلاق لے کر چلی جائیں۔ کسی کے ساتھ تسلی بخش ازدواجی زندگی گزاریں۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "نہیں میری جان! میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

"میری فکر نہ کریں۔ میں یہاں عیش و آرام سے رہوں گی۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میرے جاتے ہی یہاں سوتیلی ماں آجائے گی۔ کروڑوں کی دولت اور جائداد پر قبضہ کرلے گی۔ داؤد ابتدا میں اس سے ازدواجی رشتہ رکھے گا جیسا کہ اس نے میرے ساتھ رکھا تھا اور تم پیدا ہوئی تھیں۔ اگر سوتیلی ماں سے اولاد ہو گئی تو تمہاری حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہے گی۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "خدا جانتا ہے۔ میں تمہاری خاطر اپنے جذبات کو کچلتی آرہی ہوں۔ اٹھارہ برس تو گزر ہی چکے ہیں۔ کچھ اور برس گزر جائیں گے پھر زندگی تمام ہو جائے گی۔"

"ایسا نہ کہیں مام! مجھے دُکھ ہو رہا ہے۔ آپ نے میری خاطر آدھی جوانی یونہی گزار دی۔"

"کئی بار سوچا کہ داؤد دن رات دوسروں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ میں بھی چھپ کر اپنے جذبات کی تسکین کر سکتی ہوں۔ میں نے کوششیں بھی کیں مگر تمہارا باپ بہت ظالم ہے۔ تم دیکھتی ہو، اس نے ہم ماں بیٹی کو کتنی سخت نگرانی میں رکھا ہے؟"

سارہ نے دیکھا تھا۔ وہ ماں بیٹی لندن، پیرس اور کینیڈا جاتی تھیں۔ وہاں بھی مخنث باڈی گارڈز ان کی نگرانی کرتے تھے۔ داؤد محل میں بھی دن کے وقت وہی مخنث آتے تھے۔ جب تمام ملازمین شام کو واپس چلے جاتے تو وہ مسلح خواجہ سرا بھی محل سے باہر نکل جاتے تھے۔

داؤد اپنی بدذوقی کے مطابق وہاں لڑکے لاتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں سارہ کو اور اس کی ماں کو ان سے باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے وقت وہ مخنث گارڈز حرم سرا میں رہتے تھے۔

بیگم داؤد بڑی مدت کے بعد وسیم کو حاصل کرنے والی تھی مگر اسے بیٹی لے اڑی تھی۔ اب وہ دل کی گہرائیوں سے ماں کے دُکھ کو سمجھ رہی تھی۔ شوہر تو اس پر ظلم ڈھا رہا تھا، بیٹی بھی کم و بیش یہی کر رہی تھی۔ پیاسے ہونٹوں تک پہنچنے والے پیالے کو ماں سے چھین رہی تھی۔

بیگم داؤد آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔ سارہ اس کے پیچھے دروازے تک آئی۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا پھر کہا۔ "میری دعا ہے، تمہاری زندگی میں ایسا شخص آئے

جو کبھی لڑکے لڑکیوں کے چکر میں نہ پڑے۔ اس کے شب و روز صرف تمہارے لیے ہوں۔"

وہ بیٹی کو دعائیں دے کر وہاں سے چلی گئی۔

وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی کہ ماں اسے کس قدر چاہتی ہے۔ مائیں اپنی اولاد کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیتی ہیں۔ اس کی ماں اس کی خاطر جوانی کے حسین اور بہترین شب و روز ضائع کر چکی تھی۔

یہ آج معلوم ہوا کہ اسے کروڑوں کی واحد وارث بنائے رکھنے کے لیے وہ محرومیوں اور نامرادیوں کے آتش کدے میں سانسیں لیتی رہی ہے۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ماں جا چکی تھی۔ وہ کمرے میں آگئی۔ دروازے کو اندر سے بند کرکے باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

واقعی وہ دو بیماروں کے درمیان ایک انار تھا۔ ایک مسیحا تھا۔ کسی ایک کو شفا دے سکتا تھا۔ وہ ایک مریضہ کون تھی؟ کون قابلِ رحم تھی؟

سارہ کے دل نے کہا۔ "میں ہوں۔"

ضمیر نے کہا۔ "ہاں ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باتھ روم میں آئی۔ اسٹور روم کے دروازے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "آجاؤ۔"

وہ باہر آکر بولا۔ "خدا کا شکر ہے، وہ چلی گئیں۔ مگر پھر کسی وقت نہ آجائیں۔"

وہ اسے بازوؤں میں بھر کر بولا۔ "ہم باتھ روم میں مقدس آیتیں نہیں پڑھیں گے۔ اسٹور روم میں چلو۔ وہاں ایک دوسرے کو قبول کریں گے۔"

وہ چپ تھی۔ ایک مضبوط بازو کے حصار میں اس کے ساتھ چلتی ہوئی اسٹور روم میں آگئی۔ اس نے پوچھا۔ "اتنی خاموش کیوں ہو؟"

وہ بولی۔ "تم نے کہا تھا، اتنی بڑی دنیا میں تمہارا لہو کا کوئی رشتہ نہیں ہے؟"

"ہاں۔ کوئی نہیں ہے۔"

"تمہاری ماں کیسی تھی؟"

وہ بڑے جذب سے بولا۔ "میری ماں جیسی کوئی نہیں ہو سکتی۔ مائیں اولاد کے لیے جان دیتی ہیں۔ وہ پورے عراق کی ماں تھیں۔ انہوں نے وطنِ عزیز کی خاطر جان دے دی۔ میں ایک شہید ماں کا بیٹا ہوں۔"

سارہ نے پوچھا۔ "کیا مائیں صرف قربانیاں دینے کے لیے اولاد پیدا کرتی ہیں؟ کیا ہم اپنی ماں کے لیے قربانیاں نہیں دے سکتے؟"

"ضرور دے سکتے ہیں۔"

وہ اپنی مام کے بارے میں اسے بتانے لگی کہ وہ سہاگن ہے مگر ابھاگن ہے۔ ایک بیوہ صبر کر لیتی ہے جب شوہر مر جاتا ہے... مگر شوہر زندہ ہے اور وہ بیوہ بن کر رہتی ہے۔

وہ ماں صرف بیٹی کو عیش و عشرت کے جھولے میں جھلانے کے لیے پچھلے اٹھارہ برسوں سے پیار کے لیے ترس رہی ہے۔

اتنی مدت کے بعد ایک نوجوان اس کی زندگی میں آیا ہے۔ اگرچہ ماں کے مقابلے میں بہت کم سن ہے مگر مرد ہے۔ مرد کی عمر نہیں دیکھی جاتی۔ اپنی ضرورت دیکھی جاتی ہے۔ اگر وہ اسے نہ ملا تو محل کے اس قید خانے میں پھر شاید کوئی نہیں آئے گا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ اس نوجوان کے بعد پھر کوئی دیدہ ور نہیں آئے گا۔

اس نے سر اٹھا کر وسیم کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میری مام کو اس نوجوان کا پیار نہیں ملنا چاہیے؟"

وہ بولا۔ "ضرور ملنا چاہیے۔"

"اس نوجوان کو عمر کا حساب کرنا چاہیے؟"

"نہیں۔ تمہاری مام کی محرومیوں اور مجبوریوں کا علاج کرنا چاہیے۔"

وہ ذرا دور ہٹ کر بولی۔ "تو پھر کرو۔"

اس نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا کروں؟"

"علاج کرو۔ وہ نوجوان تم ہو۔"

وہ گھور کر بولا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ تم ہوش میں تو ہو؟"

"میں ہوش و حواس میں رہ کر بول رہی ہوں۔ تمہاری ماں نے وطن کے لیے اپنی قوم کے لیے ایک بار جان دی۔ میری مام زندہ لاش ہیں۔ پچھلے اٹھارہ برسوں سے ہر پل میرے لیے مرتی آ رہی ہیں۔"

"میں اُن کی قدر کرتا ہوں۔ اگر انہیں میرے خون کی ضرورت ہے تو میں خون دوں گا۔ میری جان کی ضرورت ہے تو جان دوں گا۔ مگر یہ دل، اس کی دھڑکنیں، اس کے سارے جذبے صرف تمہارے لیے ہیں۔"

"تم میرے لیے قربانی دو۔ مام کے آنسو پونچھو۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ میں ان کے سامنے بچہ ہوں۔"

"ابھی تم نے کہا ہے، عمر کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔"

"میری بات نہ پکڑو۔ ایسی ضد کرو گی تو میں جان کی پروا کیے بغیر یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔"

وہ بولی۔ "میری آنکھوں میں دیکھو۔"

اس نے دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں۔ وہ بولی۔ ”میں تم سے نظریں ملا کر قسم کھاتی ہوں۔ یہاں سے جاؤ گے تو اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔“

اس نے گہری سنجیدگی سے سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”نہیں جاؤں گا۔“

وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ وہ اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

وہ خواب گاہ سے گزر کر باتھ روم میں آیا پھر دروازہ کھول کر اسٹور روم میں جا کر بولا۔ ”نہ یہاں سے جاؤں گا‘ نہ تم جان دوگی۔ اور اس وقت تک یہاں سے نہیں نکلوں گا جب تک تم یہ بے ہودہ فیصلہ نہیں بدلوگی۔“

اس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ وہ دستک دیتے ہوئے بولی۔ ”باہر آجاؤ۔ کمرے میں آرام سے سو جاؤ۔ تمام رات جاگتے ہوئے گزر جائے گی۔“

”مجھے کس رشتے سے تمہارے کمرے میں سونا چاہیے؟ تم مجھے محبت اور عزت نہیں دے رہیں۔ بٹوارے کا مال بنا رہی ہو۔ میں نہیں آؤں گا۔“

اس کی ناراضی دکھ پہنچا رہی تھی۔ ماں کا دُکھ بھی بھاری تھا۔ یہ محبوب تھا‘ وہ ماں تھی۔ بیٹی کی خاطر بدترین نفسِ امارہ سے لڑتی آرہی تھی۔

وہ الجھ کر رہ گئی... کیا کرے کیا نہ کرے؟

☆☆☆

یاقوت پریشان تھی۔ کئی دن گزر گئے۔ وسیم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ اچانک ایسے گم ہوگیا جیسے اب اس دنیا میں نہ رہا ہو۔

وہ دعائیں مانگ رہی تھی۔ خود کو تسلیاں دے رہی تھی کہ وہ زندہ ہے اور جہاں بھی ہے خیریت سے ہے۔

اسے اغوا کرنے اور شرمناک دھندے سے لگانے والے پولیس افسر‘ ابو ولاد اور داؤد اسرار بھی اسے تلاش کر رہے تھے۔

داؤد نے حکم جاری کیا تھا کہ وسیم نہ ملے تو اس کے رشتے داروں کو پکڑ کر حوالات میں ڈالا جائے۔ انہیں ٹارچر کیا جائے‘ تب وہ روپوش رہنے والے کو پیش کردیں گے۔

پولیس کی گاڑی اس کے دروازے پر آئی تو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ سب مر چکے ہیں۔ وہ یاقوت کے گھر میں رہتا تھا۔

یاقوت آرمی اسپتال میں تھی۔ پولیس والے اس کی ماں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس نے تھانے سے بیٹی کو فون کیا۔ بیٹی نے اپنے سینئر انگریز ڈاکٹروں سے التجا کی۔ ”سر! میں اپنا گھر چھوڑ کر ہفتے میں پانچ دن یہاں ڈیوٹی پر رہتی ہوں۔ پولیس والوں نے کسی جھوٹے الزام میں میری ماں کو گرفتار کیا ہے۔ میں اَپ سیٹ ہوں۔ حاضر دماغی سے فرائض ادا نہیں کرسکوں گی۔ پلیز! میری ماں کو رہائی دلائیں۔“

آرمی کے ایک افسر نے پولیس افسر کو حکم دیا کہ یاقوت کی ماں کو رہا کردو اور آئندہ اسے پریشان نہ کرنا۔

فوراً ہی حکم کی تعمیل کی گئی۔ اس کی ماں کو حوالات سے نکال کر بڑی عزت سے گاڑی میں بٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔ یوں اُن ماں بیٹی کو آئندہ کے لیے پولیس کے مظالم سے نجات مل گئی۔ وہ وسیم کے معاملے میں انہیں پھر بھی پریشان کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔

یاقوت حیران تھی کہ پولیس والے وسیم کو تلاش کیوں کر رہے ہیں؟ اتنی سختی سے کیوں پیش آرہے تھے جیسے کسی عادی مجرم کو ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہوں؟

اس کی ماں نے کہا۔ ”میں نے انسپکٹر سے پوچھا‘ وہ کہہ رہا تھا کہ کم عمر جوانوں نے ایک گروہ بنایا ہے۔ اس گروہ میں وسیم ہے۔ یہ لوگ گھروں میں گھس کر چوریاں کرتے ہیں اور وسیم نے ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار کے گھر میں چوری کی ہے۔“

یاقوت نے کہا۔ ”وہ انسپکٹر بکواس کرتا ہے۔ آپ جانتی ہیں ہمارا وسیم کتنا معصوم ہے۔“

ماں نے کہا۔ ”تعجب ہے‘ ایسے نیک اور شریف لڑکے پر جھوٹا الزام کیوں لگایا جا رہا ہے؟“

یاقوت نے کہا۔ ”اسی لیے وہ میرے پاس نہیں آیا۔ پولیس کے خوف سے کہیں چھپا ہوا ہے۔ میں اپنے سینئر ڈاکٹروں سے درخواست کروں گی کہ وہ وسیم کو جھوٹے الزامات سے بری کرائیں۔ اسے میرے پاس آکر رہنے کی آزادی دیں۔ یہ یقین دلائیں کہ پولیس بھی اسے گرفتار نہیں کرے گی۔“

اس نے دوسرے ہی دن وسیم کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں درخواست لکھ کر دی۔ اس اسپتال کے ڈاکٹر آرمی افسر تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”لڑکے کو یہاں پیش کرو۔ اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔“

وہ اسے کیسے پیش کرتی؟ وہ کہاں تھا‘ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے دی لائن آف اللہ بریگیڈ کے مجاہدین سے رابطہ کیا۔ ان سے التجا کی کہ وہ وسیم کو تلاش کریں۔ معلوم کریں اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ کیوں روپوش ہے؟

ایک مجاہد نے کہا۔ ”وہ پچھلے ایک ہفتے سے لاپتا ہے۔ جہاں بھی ہوگا‘ وہاں سے کسی بھی طرح تم سے رابطہ کرسکتا

ہے۔ تمہارا فون نمبر جانتا ہے۔ تمہیں تسلیاں دے سکتا ہے کہ زندہ سلامت ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے‘ وہ زندہ ہوگا؟“

”ہاں۔ میں اس کی موت کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ وہ بہت اچھا ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے۔ پلیز! اسے تلاش کرو۔“

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اسے ڈھونڈیں گے... مگر کہاں ڈھونڈ سکتے تھے؟ وہ ایسے گھر میں تھا کہ گھر والا بھی اسے باہر تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

ایک پولیس افسر نے داؤد اسرار کو اطلاع دی۔ ”سر! وسیم کا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔ وہ ایک پڑوسن کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے اس عورت کو گرفتار کیا تھا لیکن ایک آرمی افسر کے حکم سے اسے واپس گھر پہنچانا پڑا۔“

داؤد نے پوچھا۔ ”اس عورت نے آرمی افسر کی سفارش کیسے حاصل کرلی؟“

”یاقوت نامی ایک لیڈی ڈاکٹر آرمی اسپتال میں جاب کرتی ہے۔ وہ اپنے ذرائع استعمال کر رہی ہے۔ اس نے وسیم کے لیے بھی یہ رعایت حاصل کی ہے کہ وہ گھر آئے گا تو ہم اسے گرفتار نہیں کریں گے۔ اس پر جو بھی الزامات ہیں، ان کی مکمل رپورٹ ہمیں آرمی افسران کو پیش کرنی ہوگی۔“

”ایسی رپورٹ تیار کرو کہ وہ اتحادی فوج کا دشمن ثابت ہوجائے۔“

”سر! سچ مچ اس کا خاندان امریکی اتحادیوں کا دشمن ہے۔ آپ نے سنا ہوگا‘ اُم حفصہ نے فوجی ٹرکوں کے درمیان آکر خودکش حملہ کیا تھا۔ وسیم اسی عورت کا بیٹا ہے۔“

”یہ ہوئی نا بات... اب تو میں اس لڑکے کو نچوڑ کر رکھ دوں گا۔“

”صرف اتنا ہی نہیں سر! آپ سراج مصطفیٰ کے بارے میں بھی جانتے ہیں۔ اس نے گیس چیمبر میں سزائے موت پائی۔ وہ وسیم کا بڑا بھائی تھا۔“

”یعنی اس کا پورا خاندان دہشت گرد ہے۔ فوراً یہ رپورٹ آرمی افسران تک پہنچاؤ... وہ اس لڑکے کو گولی مارنے کا حکم دیں گے۔“

وسیم نے ایک چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔ اب اس پر اتحادی فوجیوں کو مارنے کا الزام عائد ہو رہا تھا۔ یہ رپورٹ پیش کی جانے والی تھی کہ اس دہشت گرد خاندان کا لڑکا اسی لیے روپوش ہوگیا ہے کہ چھپ کر فوجیوں پر حملہ کرنے والوں کی مدد کر رہا ہے۔

آرمی افسران نے جب وہ رپورٹ پڑھی تو یاقوت کو طلب کیا۔ پھر اس سے کہا۔ ”تم نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ تم جس لڑکے کے لیے سیکیورٹی چاہتی ہو‘ وہ اُم حفصہ کا بیٹا اور سراج مصطفیٰ کا بھائی ہے؟“

”سر! اس لیے نہیں بتایا کہ اس کا پورا خاندان نابود ہو چکا ہے۔ یہ لڑکا معصوم ہے۔ مجاہدین کے کسی گروپ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”ہم کیسے یقین کریں کہ وہ باغی نہیں ہے؟ اور اگر نہیں ہے تو روپوش کیوں ہے؟“

”وہ روپوش نہیں ہے۔ پتا نہیں‘ کن مصیبتوں میں گرفتار ہے؟ مجھ سے رابطہ نہیں کر رہا۔ یقیناً کہیں مجبور ہوگیا ہے۔“

”وہ اپنی ماں اور بھائی کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔ پولیس کی اطلاع کے مطابق اسے باغیوں کے ایک ایسے گروہ میں دیکھا گیا ہے جو ہمارے فوجیوں پر حملہ کرکے فرار ہو رہے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ فرار ہوگیا ہے۔“

”پولیس والے جسے چاہتے ہیں‘ مجرم بنا دیتے ہیں اور جس مجرم کو چاہتے ہیں اسے شرافت کا سرٹیفکیٹ دے دیتے ہیں۔“

”تم پولیس والوں کو غلط ثابت کرو۔ اسے خفیہ پناہ گاہ سے نکالو اور یہاں پیش کرو۔ ہم اس سے انصاف کریں گے۔“

وہ قسمیں کھا کر کہنے لگی کہ وہ باغی نہیں ہے۔ جب بھی اس سے رابطہ ہوگا تو وہ اسے آرمی افسران کے سامنے پیش کردے گی اور افسران کہہ رہے تھے کہ وسیم پیش ہونے کے بعد ہی الزامات سے بری ہوسکتا ہے۔

وہ دو دن کے لیے اسپتال سے گھر آئی تو ایک مجاہد اکبر علی سیستانی نے فون پر کہا۔ ”یاقوت! تم پر بڑی مصیبتیں آنے والی ہیں۔ فوراً گھر سے نکلو۔ ہماری گاڑی آرہی ہے۔ ہم کسی بھی گلی سے تمہیں اٹھا کر لے آئیں گے۔“

وہ ایک بیگ میں ضروری سامان رکھ کر گھر سے نکلتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنی گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جا رہی ہوں۔ مجھے کچھ تو بتاؤ‘ یہ سب کیا ہے؟“

رابطہ ختم ہوگیا۔ دوسری گلی میں پہنچتے ہی ایک گاڑی اس کے قریب آکر رکی۔ اس میں چھ مسلح مجاہدین تھے۔ وہ اکبر علی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گاڑی فوراً ہی آگے روانہ ہوگئی۔

یاقوت نے کہا۔ ”سی آئی اے والے مجھے تم لوگوں کے ساتھ دیکھ لیں گے۔“

اکبر علی نے کہا۔ ”وہ تمہیں گرفتار کرنے کسی بھی وقت تمہارے گھر آسکتے ہیں۔ یہ بھید کھل گیا ہے کہ تم ہمارے لیے کام کرتی ہو۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ راز کیسے منکشف ہوگیا؟“

”ہم نے تمہاری بہن اور تمہارے باپ کے قاتلوں کو

ہلاک کرنے سے پہلے اُن سے کہا تھا کہ انہوں نے یاقوت کے گھر جو واردات کی ہے انہیں اس کی سزا مل رہی ہے۔"

دوسرے مجاہد نے کہا۔ "ہمارا خیال تھا' وہ اسی وقت مر جائیں گے۔ ہماری باتیں کسی سے کہہ نہیں سکیں گے لیکن ان میں سے ایک زخمی ہوکر وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس تقریب میں گولیاں چلانے والے اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کرنے والے یاقوت کے حمایتی تھے۔"

اکبر علی نے کہا۔ "جس پولیس انسپکٹر کو میں نے گولی ماری تھی' اُس نے مرتے مرتے کاغذ پر میرا نام اکبر علی سیستانی اور دی لائن آف اللہ بریگیڈ لکھا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوگیا کہ تم ہمارے گروہ سے تعلق رکھتی ہو اور اتحادیوں کے خلاف ہمارے لیے کام کرتی ہو۔"

وہ پریشان ہوکر بولی۔ "کیا میں بے گھر ہو چکی ہوں؟ میری ملازمت ختم ہو چکی ہے؟ وہاں جاؤں گی تو مجھے حراست میں لے لیا جائے گا؟"

"ہاں۔ تم پر ٹارچر کیا جائے گا۔ ہمارا نام اور پتا ٹھکانا اُگلوایا جائے گا۔ خدا کا شکر ہے۔ اب تم ان کی گرفت میں نہیں آؤ گی۔ ہماری گروہ کی خواتین کے ساتھ رہو گی۔"

"اس طرح تو میری امی تنہا اور بے یارو مددگار ہو گئی ہیں۔ پھر یہ کہ وسیم کہیں سے بھٹکتا ہوا گھر آ سکتا ہے۔ وہ پکڑا جائے گا۔"

اکبر علی نے کہا۔ "ہم تمہاری ماں اور وسیم پر نظر رکھیں گے۔ انہیں گرفتار کرنے والوں سے نمٹنے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔"

دوسرے نے کہا۔ "فی الحال تمہیں تحفظ فراہم کرنا لازمی تھا۔ اس اسپتال کے ڈاکٹر اور آرمی افسران دھوکا برداشت نہیں کریں گے۔ تمہیں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم دیں گے۔"

وہ سر جھکا کر اپنی ماں اور وسیم کے بارے میں سوچنے لگی۔ فی الحال صرف سوچ ہی سکتی تھی' کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

اور واقعی مجاہدین کی معلومات درست تھیں۔ ایک پولیس وین یاقوت کے دروازے پر آئی تھی۔ بیٹی نہ ملی تو وہ ماں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس بے چاری کو حوالات میں ڈال کر اس پر ظلم کرنے لگے۔ پوچھنے لگے۔ "بولو! بیٹی کہاں چھپنے گئی ہے؟ وہیں وسیم بھی ہوگا۔ اس کا پتا ٹھکانا بتاؤ۔"

وہ کچھ جانتی نہیں تھی اس لیے مار کھاتی رہی۔ داؤد اسرار نے کہا۔ "وہ وسیم کے پاس چھپنے نہیں گئی ہوگی۔ اسے مجاہدین پناہ دے رہے ہیں۔ وسیم تک پہنچنے کی ایک تدبیر ہے۔ ٹی وی چینلز کے ذریعے اس کی تصویر نشر کی جائے اور یاقوت کی طرف سے یہ پیغام دیا جائے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے' فون کے ذریعے اپنی مسٹر سے رابطہ کرے۔"

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ "یاقوت کہہ رہی تھی' وہ فون کے ذریعے بھی اس سے رابطہ نہیں کر رہا ہے... کیونکہ نہ اس کے پاس موبائل فون ہے نہ وہ یاقوت کا نمبر جانتا ہے۔"

داؤد نے کہا۔ "ہم اپنی طرف سے ایک نمبر نشر کریں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ وہ یاقوت کا نیا فون نمبر ہے۔ اس طرح وہ ضرور اس پر کال کرے گا۔"

انہیں یقین تھا کہ اس تدبیر پر عمل کرکے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جائیں گے۔ داؤد کے لیے یہ بڑی تذلیل کی بات تھی کہ اس کے عیش کدے میں آنے والے لڑکے نے ایک مضبوط سیکیورٹی کو توڑ کر اور وہاں سے فرار ہوکر اس کا سر جھکا دیا تھا۔

ابھی اسے خبر نہیں تھی کہ بیٹی کے حوالے سے بھی ایسا سر جھکے گا کہ وہ شرم سے ڈوب مرے گا یا لوگوں سے منہ چھپاتا پھرے گا... یا پورے گھر کو آگ لگا کر جل مرے گا۔

ایک لڑکے کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اپنے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

☆☆☆

عجیب حالات درپیش تھے۔ سارہ بڑی آسانی سے بِلا روک ٹوک کے بغیر وسیم سے ازدواجی رشتہ قائم کر سکتی تھی۔ انہوں نے بڑی شرافت اور نیک نیتی سے فیصلہ کیا تھا کہ جذبات میں اندھے ہوکر گناہ گار نہیں بنیں گے۔ دینی احکامات کے مطابق پہلے ایک دوسرے کے نکاح میں آئیں گے، یوں اپنے ضمیر کو مطمئن رکھیں گے۔

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ سارہ کا ضمیر اسے ماں کی قربانیوں کا شدت سے احساس دلا رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ جذباتی ہوکر سوچ رہی تھی کہ اسے ماں کی خاطر اپنے پیار کی قربانی دینی چاہیے اور وسیم سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔

ان جذباتی لمحات میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کا ضمیر انتہائی بچکانا اور احمقانہ انداز میں قربانی چاہتا ہے۔

وسیم اسٹور روم میں جا کر بند ہو گیا۔ وہ خواب گاہ میں آ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت رات کے چار بج رہے تھے۔ ایک آدھ گھنٹے میں صبح ہونے والی تھی۔ وہ اس کی سہاگ رات ہو سکتی تھی مگر اب گزر رہی تھی اور گزرتے ہوئے وقت کو روکا نہیں جا سکتا۔

ان لمحات میں اسے ماں کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا۔ "جب تک کوئی ہاتھ نہ لگائے' تب تک خیر ہے۔ ہاتھ لگانے کے بعد عورت پھر ویسی ہی گرفت ڈھونڈتی رہتی ہے۔"

داؤد اسرار نے اسے ایک بیٹی کی ماں بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ ایک مرد کی قربت سے دور کر دیا تھا۔ بیگم داؤد نے اسی قربت

اور دوری کے حوالے سے اپنا دکھ بیان کیا تھا۔

لیکن یہی دکھ بیٹی کا بھی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ کسی حد تک وسیم کے لمس سے آشنا ہو چکی تھی اور اب تنہائی میں اس کی قربت چاہ رہی تھی۔ وہ بے چین ہوکر ادھر اُدھر ٹہلنے لگی۔

تنہائی میں بھٹکنے کی یہی خرابی ہوتی ہے۔ بعد میں دل و دماغ کے اندر شیطان اُچھلتا رہتا ہے۔ ایک کے بعد دوسرے تیسرے گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔ جیسے اس کی ماں کو لے جا رہا تھا۔

سارہ نے چونک کر سوچا۔ 'ہاں۔ مام تو گناہ کی طرف جانا چاہتی ہیں۔ پاپا سے طلاق نہیں ہوئی ہے۔ پھر وہ وسیم کے ساتھ کیسے تعلق قائم کر سکتی ہیں؟'

اس نے حیرانی سے سوچا۔ 'یا خدا! یہ بات میرے دماغ میں پہلے کیوں نہیں آئی؟'

اس لیے نہیں آئی کہ ماں کی محرومیاں دور کرنے کے لیے وہ جذبات میں اندھی ہو گئی تھی۔ دماغ سے سوچنا بھول گئی تھی۔

وہ اس پہلو سے بار بار سوچنے لگی۔ جب وہ گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی' پہلے وسیم کے لیے جائز ہو جانا چاہتی تھی تو پھر اسے ماں کے ناجائز ارادوں پر اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ اس کے... برعکس وہ اپنی مام کی مظلومیت کو اہمیت دے رہی تھی۔

وہ بیڈ سے اتر کر باتھ روم میں آئی۔ پھر اسٹور روم کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے بولی۔ "میں ہوں سارہ... دروازہ کھولو۔"

اندر خاموشی رہی۔ وہ ناراض تھا۔ اس سے بولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم مجھ سے بات نہیں کرو گے مگر میں نے فیصلہ بدل دیا ہے۔ تم میرے ہو۔ صرف میرے ہی رہو گے۔ اب تو دروازہ کھولو۔"

وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ سارہ ایک دم ہی اس سے لپٹ گئی۔ "سوری! میں مام کی طرف سے بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ اب سمجھ رہی ہوں۔ خدا نے تمہیں میرے لیے بھیجا ہے۔ میں تمہیں ایک پل کے لیے بھی دور جانے نہیں دوں گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک جذبات سے مغلوب رہے۔ پھر فوراً ہی الگ ہو گئے۔ کہیں دور سے فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ سارہ نے کہا۔ "تم نماز پڑھتے ہو؟"

"کبھی پڑھتا ہوں' کبھی نہیں پڑھتا۔"

"ابھی پڑھو۔"

"آؤ۔ ہم کمرے میں پڑھیں گے۔"

"میں مام کے ساتھ پڑھوں گی۔ وہاں جا رہی ہوں۔ ان سے ضروری باتیں کروں گی۔"

وسیم نے پریشان ہوکر اسے دیکھا پھر کہا۔ "ابھی نہ جاؤ۔ ہم نماز کے بعد ایک دوسرے سے ایجاب و قبولیت کریں گے۔"

"ضرور کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے اپنی ماں کو اعتماد میں لینا چاہتی ہوں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میرے مجازی خدا اور اُن کے داماد بننے والے ہو۔"

وسیم نے اعتراض کیا۔ "سارہ! گڑبڑ ہو جائے گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تم اطمینان رکھو۔ میں ابھی آ جاؤں گی۔"

"تم اپنی مام کے معاملے میں عقل سے سوچنا سمجھنا بھول گئی ہو۔ پہلے ایک غلطی کرنے والی تھیں، اب اس غلطی سے توبہ کرکے دوسری کرنے جا رہی ہو۔"

"میں پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ ہماری بات نہیں بگڑے گی بلکہ بنے گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے بولی۔ "وہیں رک جاؤ۔ دروازہ بند کر لو۔ بھول سے بھی باہر نہ آنا۔ خفیہ کیمروں کی آنکھیں تمہیں دیکھ لیں گی۔"

وسیم نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ محل کے مختلف حصوں سے گزرتی ہوئی بیگم داؤد کے کمرے میں آئی۔ وہ نماز کے لیے مصلا بچھا رہی تھی۔ ماں بیٹی نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سارہ نے وضو کیا۔ پھر اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نماز ادا کرنے لگیں۔

بیگم داؤد جیسی محرومیوں کا شکار رہنے والی عورتیں اگرچہ بہکتی ہیں' گناہ گار بھی بن جاتی ہیں لیکن خدا کا خوف لازمی رہتا ہے۔ وہ گناہوں سے توبہ کرنے کے لیے اور اپنا دھیان عبادت کی طرف لگائے رکھنے کے لیے نمازیں ضرور پڑھتی ہیں۔

بیگم بھی بہکتے اور ڈگمگاتے جذبات سے مغلوب رہتی تھی اور نمازیں بھی پڑھتی تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ صرف خیالات کی حد تک گناہ گار ہے۔ ورنہ آج تک داؤد کے سوا کسی بھی مرد سے تنہائی میں بات تک نہیں کی ہے۔

اور یہ پارسائی شاید اس لیے بھی تھی کہ اسے سخت پردے اور پابندیوں میں رکھا گیا تھا۔ نہ کوئی کھلاڑی آیا تھا' نہ کوئی کھیل کھیلا گیا تھا۔

وہ نماز کے بعد دعا مانگ کر اٹھنا چاہتی تھی۔ سارہ نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بیٹھی رہیں۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

وہ بیٹی کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ اس نے کہا۔ "آپ پورے محل میں اسے تلاش کر رہی ہیں۔ وہ مل جائے گا تو کیا اسے پاپا کی جگہ دیں گی؟"

وہ ہاتھ چھڑا کر بولی۔ ”یہاں سے اٹھو۔ صوفے پر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“

سارہ نے اٹھنے نہیں دیا پھر ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”خدا دلوں کے بھید جانتا ہے۔ آپ یہاں نماز پڑھتی ہیں۔ یہیں اپنے اندر کی باتیں کریں۔“

وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”ایسی باتیں مصلے پر نہیں کی جاتیں۔“

”کیا یہاں خدا سن رہا ہے اور صوفے پر نہیں سنے گا؟“

وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔ ”یہ کیا ضد ہے؟ یہاں بیٹھ کر بات کیوں کرنا چاہتی ہو؟“

”یہاں آپ جلد ہی غلطی تسلیم کرلیں گی۔“

وہ گھور کر بولی۔ ”کیسی غلطی؟“

”یہی کہ جب تک پاپا کے نکاح میں ہیں، تب تک کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے مگر آپ کررہی ہیں۔“

”اور وہ جو تمہارا باپ میری حق تلفی کرتا ہے، دوسری جگہ منہ کالا کرتا رہتا ہے... تو کیا وہ درست کرتا ہے؟“

”وہ بڑے گناہ گار ہیں۔ کیا آپ بھی ایسا کریں گی جو پاپا کرتے ہیں؟“

”جو وہ کریں گے، وہی میں بھی کروں گی۔“

”وہ نماز نہیں پڑھتے، آپ بھی نہ پڑھیں۔ وہ شراب پیتے ہیں، آپ بھی نوش فرمائیں۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ جو میری خواہش ہوگی، میں وہی کروں گی۔“

”یہ مصلا، یہ نماز ہمیں خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لیے ہے۔ اس لیے میں نے آپ کو یہاں بٹھا کر رکھا ہے۔ دیکھیں اور سمجھیں... ابھی آپ کہاں ہیں؟“

وہ مصلے پر پہلو بدلنے لگی۔ جو بے ایمان ہوتے ہیں، وہ مسجد میں بھی اپنی بے ایمانی تسلیم نہیں کرتے۔ سارہ نے کہا۔ ”یہاں خدا ہے اور میں ہوں آپ کی بیٹی... آپ ایمان کے ساتھ کہیں گی کہ آپ کو خواہشات کی داشتہ بن کر نہیں رہنا ہے۔ فطری خواہشات حاوی ہورہی ہیں تو آپ پاپا سے طلاق لے کر کسی کے ساتھ جائز ازدواجی زندگی گزاریں گی۔“

”میں داؤد سے طلاق لے کر تمہاری زندگی برباد نہیں کروں گی۔“

”مجھے بربادی سے بچانے کے لیے گناہوں کی دلدل میں جائیں گی تو میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ خدا میرے ساتھ ہے۔ مجھے پاپا پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ مجھے جائز حقوق سے محروم نہیں کریں گے۔ آپ میرا سہارا لے کر گناہ کا راستہ ہموار نہ کریں۔“

بیگم داؤد نے بیٹی کو دیکھا پھر نظریں جھکالیں جیسے ڈھیلی پڑ گئی ہو۔ وہ شکست خوردہ سی ہو کر بولی۔ ”میں خوابوں اور خیالوں میں زندگی گزار رہی ہوں۔ جانتی ہوں، یہاں میری تنہائی میں کوئی نہیں آئے گا۔ وہ وسیم آیا تھا۔ میں نے اسے بہلاوا بنالیا۔ وہ جوان ہے مگر میرے لیے ایک کم سن لڑکا ہے۔ وہ فرار ہوگیا ہے مگر جب کہتی ہوں کہ وہ یہیں محل میں چھپا ہوا ہے تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ جیسے میں کبھی پورے نہ ہونے والے جذبوں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ خود کو بہلا رہی ہوں۔ یہ سوچ کر اچھا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے چھپ رہا ہے۔ کسی وقت اچانک ہی سامنے آجائے گا۔“ وہ مصلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں اسے چھو کر کہتی ہوں کہ وہ محل سے بھاگ گیا ہے۔ بس میں بہکتی ہوں، مجھے بہلنے دو۔“

”اگر وہ سچ مچ آجائے تو...؟“

”تو...“ وہ سوچنے لگی۔

سارہ نے پوچھا۔ ”پھر تو وہ دل کو بہلانے والا خواب و خیال نہیں رہے گا... تب آپ کیا کریں گی؟“

وہ بولی۔ ”اونہہ... وہ یہاں سے جاچکا ہے۔“

”آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ اگر وہ سامنے آجائے گا، تب آپ کے خیالات اور جذبات کیا ہوں گے؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”کیا بولوں؟ نماز کی جگہ بیٹھی ہوں۔“

”یہی دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہاں سے ایمان کے ساتھ اٹھیں گی یا نہیں؟“

وہ ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ”میں ان لمحات میں دعا مانگتی ہوں، خدا میرا ایمان سلامت رکھے۔ اگر وہ آئے گا تو غصہ دکھاؤں گی کہ جب عزت بچا کر بھاگ گیا تھا تو پھر مرنے کیوں آیا ہے؟“

”وہ مرنے نہیں، میرے ساتھ جینے آیا ہے۔“

اس نے چونک کر بیٹی کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”وہ میرے دل و دماغ میں سما گیا ہے۔ میں اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔“

”تم بھی میری طرح بہک رہی ہو۔ یہ بھول رہی ہو کہ ایسے معاملات میں باپ کیسا ظالم ہے؟ تمہیں گولی ماردے گا۔“

”میں نہیں جانتی، آئندہ کیا ہوگا؟ بس یہ حوصلہ ہے کہ موت آئے گی تو اُسی کے ساتھ مروں گی۔“

”تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے وہ سچ مچ تمہارے پاس آگیا ہے؟“

”یس مام! وہ میرے پاس ہے۔ میرے بیڈروم میں ہے۔“

وہ حیرانی سے بولی۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کیا اس محل سے بھاگنا اور پھر واپس آنا بچوں کا کھیل ہے؟“

”وہ فرار نہیں ہوا تھا۔ میں نے اسے کل سے چھپا کر رکھا ہے۔“

وہ حیرانی اور بے یقینی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو اٹھو۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین کروں گی۔“

سارہ نے پھر اسے بٹھالیا۔ ”آپ ابھی اسے دیکھیں گی۔ پہلے یہ بتائیں کہ اس کے متعلق اب آپ کی کیا رائے ہے؟“

”میری کیا رائے ہوگی؟ اگر وہ سچ مچ یہاں ہے تو مرنے کے لیے رہ گیا ہے۔ داؤد اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس کی لاش ہی یہاں سے جائے گی۔“

”اُس کے ساتھ میری بھی لاش جائے گی۔“

ماں نے کہا۔ ”تمہارے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ واقعی تمہارے کمرے میں ہے۔“

”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟ میں اسے اپنا لائف پارٹنر، اپنا مجازی خدا تسلیم کررہی ہوں۔ اب اس کے متعلق آپ کے جذبات اور احساسات کیا ہیں؟“

”میں تم دونوں کے جنازوں پر فاتحہ پڑھوں گی۔ کیوں اس کے لیے پاگل ہورہی ہو؟ جبکہ بڑے بڑے گھرانوں سے تمہارے رشتے آرہے ہیں۔ نکالو اس لڑکے کو یہاں سے۔ اسے اس طرح محل سے بھگاؤ کہ وہ پکڑا جائے تو تم پر الزام نہ آئے۔“

”یعنی وہ آپ کے ہتھے چڑھتا تو نیکی کرتیں؟ اپنا اُلو سیدھا کرتیں پھر اسے الٹا لٹکانے کے لیے سیکیورٹی گارڈز کے حوالے کردیتیں؟“

”عقل سے کام لو۔ میری مانو اور یہی کرو۔“

”سوری مام! میں نے ماں سمجھ کر آپ پر اعتماد کیا تھا۔ آپ جائیں۔ گارڈز کو میرے کمرے میں بھیج دیں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”وہاں ہم زندہ نہیں ملیں گے۔ یہ میرا عزم ہے۔ آخری سانسوں تک وسیم کے ساتھ رہوں گی اور یہ آخری سانسیں ابھی پوری ہوجائیں گی۔“

وہ جانا چاہتی تھی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ پھر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں تمہاری دشمن ہوں؟ تمہاری خاطر جی رہی ہوں۔ تمہاری خاطر داؤد سے اور دنیا والوں سے لڑ جاؤں گی۔ مجھے لے چلو اس کے پاس... ہم تمام خطرات سے کھیلتے ہوئے اسے آخری دم تک یہاں چھپا کر رکھیں گے۔“

سارہ خوش ہو کر اس سے لپٹ گئی۔ ”آئی لو یو مام! خدا کے بعد آپ نے مجھے پیدا کیا ہے۔ اب میرے دو پیدا کرنے والے ہمارے ایجاب و قبولیت کے گواہ رہیں گے۔“

اس نے بیٹی کو پیار کیا پھر وہاں سے نکل کر اس کے بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔ وہ دونوں داؤد محل کے زنداں میں تھیں مگر بڑے حوصلے سے زنداں میں پھول کھلا رہی تھیں۔

☆☆☆

ساؤتھ زون کے چند اتحادی فوجی افسران غصے سے پیچ و تاب کھارہے تھے۔ غصہ اس بات کا تھا کہ ایک لیڈی ڈاکٹر یاقوت اُن کی ناک کے نیچے رہ کر مخالفین کے لیے کام کررہی تھی اور امریکی سی آئی اے والے اسے پہچان نہ پائے۔ پچھلے کئی حملوں کی رپورٹس کی چھان بین سے انکشاف ہورہا تھا کہ یاقوت کی مخبری کے باعث درجنوں اتحادی فوجی موت کے گھاٹ اتر گئے تھے اور سیکڑوں زخمی اور اپاہج ہو کر گھروں کو چلے گئے تھے۔

غصہ اس بات پر زیادہ تھا کہ وہ گرفت میں نہیں آئی تھی۔ کہیں روپوش ہوگئی تھی۔ اس علاقے کے پولیس افسران سے جواب طلبی ہورہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے، انہوں نے اُس کی ماں کو گرفتار کیا تھا۔ وہ یاقوت کی پُراسرار سرگرمیوں تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن اسپتال کے آرمی افسران کی سفارش کے باعث اسے ڈھیل مل گئی اور وہ فرار ہوگئی۔

آرمی افسران کی ایک میٹنگ میں داؤد اسرار نے کہا۔ ”خود کش حملہ کرنے والی اُم حفصہ کا بیٹا وسیم بہت اہم ہے۔ وہ یاقوت کے گھر میں رہا کرتا تھا۔ فی الحال وہ دونوں ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان فون پر ضرور رابطہ ہوگا۔ وہ ایک دوسرے سے ملنے کی کوششیں بھی کریں گے اور ایسے وقت ہمارے سپاہیوں اور جاسوسوں کی نظروں میں آجائیں گے۔“

ایک آرمی افسر نے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ فون سے رابطہ کررہے ہیں یا نہیں؟“

داؤد نے کہا۔ ”ہماری معلومات کے مطابق وسیم کے پاس موبائل فون نہیں ہے اور نہ ہی وہ یاقوت کا نمبر جانتا ہے۔ ہم ٹی وی چینلز کے ذریعے وسیم کے لیے یاقوت کا پیغام نشر کررہے ہیں اور اس کا فون نمبر بھی پیش کررہے ہیں۔ اگر وسیم اس نمبر پر بات کرے گا تو ہماری ایک جاسوس لڑکی اسے یاقوت بن کر دھوکا دے گی۔ کہے گی کہ وہ ایک بہت ہی محفوظ پناہ گاہ میں ہے۔ وسیم کو فوراً وہاں آنا چاہیے۔“

ایک آرمی افسر نے سر ہلا کر کہا۔ ”ہاں۔ اگر وہ لڑکا پوری طرح محفوظ نہیں ہوگا تو تمہاری جاسوس لڑکی کو یاقوت سمجھ کر دوڑا چلا آئے گا۔“

”یس سر! یہی ہماری پلاننگ ہے۔ وہ لڑکا گرفت میں آئے گا تو ہم پھر ویسی ہی چال چلیں گے۔ ٹی وی چینلز کے

ذریعے وسیم کا پیغام یاقوت کے لیے نشر کیا جائے گا۔ اس کا فون نمبر بھی بتایا جائے گا۔ وہ خود اس نمبر پر وسیم سے رابطہ کرے گی۔ اسے معلوم ہوگا کہ وہ بہت ہی محفوظ پناہ گاہ میں ہے تو وہ بے خوف وخطر اس سے ملنے چلی آئے گی۔"

اس پلاننگ میں جان تھی۔ انہیں یقین تھا کہ خاطر خواہ نتائج حاصل ہوں گے۔

ایک آرمی افسر نے کہا۔ "حارث الجمالی کو سزائے موت دی گئی ہے۔ اس سزا پر عمل درآمد کے لیے اسے ابوغریب جیل سے سلیمانیہ کے ڈیتھ ہاؤس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔"

پھر اس نے ایک فائل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے حارث کی ہسٹری فائل میں یاقوت کا نام پڑھا ہے۔ ایک برس پہلے وہ دونوں میڈیکل کے اسٹوڈنٹس تھے اور شادی کرنے والے تھے۔ اس سے پہلے حارث دی لائن آف اللہ بریگیڈ میں شامل ہوگیا اور یاقوت ہاؤس جاب کے لیے آرمی اسپتال میں آگئی۔"

افسر نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ یاقوت ہاؤس جاب کرنے نہیں' ہمارے دشمنوں کے لیے مخبری کرنے آئی تھی۔ ہم حکم دیتے ہیں' اُسے آن دی اسپاٹ شوٹ کر دیا جائے۔"

یاقوت اور تمام مجاہدین اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے لیے سزائے موت کے احکامات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سب ہی سر پر کفن باندھے پھرتے تھے۔ خوف خدا رکھنے والے موت سے خوف کھانا نہیں جانتے۔

مجاہدین کا کوئی ایک مستقل ٹھکانا نہیں تھا۔ اپنے ہی ملک کے سپاہی اور انٹیلی جنس والے ان کا سراغ لگاتے اور ان پر حملے کرتے رہتے تھے۔ وہ مقابلہ کرتے تھے۔ غلام سپاہیوں کو مار بھگاتے تھے۔ کبھی خود فرار ہو کر اپنے کسی خفیہ اڈے سے محروم ہو جاتے تھے۔

وہ پیچھے ہٹنا' ہٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا خوب جانتے تھے۔ میدانوں اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں مورچے بنا کر رہتے تھے۔ پھر کسی سمت نکل جاتے تھے۔ اصل مسئلہ ان خواتین کا تھا جو ان کے ساتھ غاصبوں کے خلاف جنگ لڑ رہی تھیں۔ ان کے لیے کہیں بھی چھت اور چار دیواری لازمی ہو جاتی تھی۔

جو خواتین سی آئی اے والوں کی اور سپاہیوں کی نظروں میں نہیں آئی تھیں' وہ آزادی سے رہتی تھیں جیسا کہ یاقوت اب تک رہتی آئی تھی۔ وہ اپنے مکمل ریکارڈز اور تمام تصاویر کے ساتھ تمام مخالفین کی نظروں میں آگئی تھی۔ اس کی تصاویر تمام پولیس اسٹیشنوں میں پہنچا دی گئی تھیں۔ ان کے ذریعے وسیم کو ٹریپ کیا جاتا تھا۔ اس لیے ٹی وی اور ریڈیو چینلز کے ذریعے اسے مفرور اور دہشت گرد خاتون نہیں کہا جا رہا تھا۔

وسیم کو گرفتار کرنے تک حقیقت چھپائی جا رہی تھی۔

ٹی وی کے کئی چینلز کی اسکرین پر یاقوت اور وسیم کی تصویریں پیش کی جا رہی تھیں اور کہا جا رہا تھا کہ یہ یاقوت العزیزی ہے اور یہ وسیم مصطفیٰ ہے۔ یاقوت اپنے اس منہ بولے بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔ اگر وہ کہیں یہ پیغام سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے تو اسکرین پر نظر آنے والے فون نمبر پر یاقوت سے رابطہ کرے۔

یہ پیغام بھی دیا جا رہا تھا کہ وسیم کی طرح یاقوت کا گھر اجڑ گیا ہے۔ اس کی بھی بہن اور ماں باپ ہلاک ہوچکے ہیں۔ وہ تنہا ہے اور اپنے وسیم کو پکار رہی ہے۔ لہٰذا وہ جہاں بھی ہے' فوراً اس سے فون پر رابطہ کرے۔ ایسے مصائب میں اسے اپنی سسٹر کے ساتھ رہنا چاہیے یا کم سے کم فون پر دو باتیں کر لینی چاہئیں۔

یاقوت چند مجاہدین کے ساتھ چھپتی پھر رہی تھی۔ اسے کسی چار دیواری میں رہ کر ٹی وی دیکھنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس گروہ کے سربراہ نے اس سے کہا۔ "جیسا کہ تم جانتی ہو' عیسائیوں کی ریڈ کراس ٹیم دنیا کے تمام آفت زدہ علاقوں میں پہنچ کر زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی ہے۔ بیماروں کو مفت دوائیں اور بھوکے ننگوں کو روٹی اور کپڑے دیتی ہے۔ ایسی ریڈ کراس ٹیم عراق کے بھی کئی شہروں میں ہے۔"

یاقوت نے کہا۔ "جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ ہمارے گروہ کی دو خواتین اس ٹیم میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔"

"ہاں۔ ان عیسائیوں کو ہماری زبان بولنے والوں کی ضرورت رہتی ہے تاکہ وہ ہمارے ذریعے یہاں کے لوگوں کی باتوں کو اور ضرورتوں کو سمجھ سکیں۔ تم بھی ایسی ہی ایک ٹیم میں عیسائی نن بن کر رہ سکتی ہو۔"

وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ مجھے عیسائی بننے کو کہہ رہے ہیں؟"

"ہم گرفتاری اور سزائے موت سے بچنے کے لیے عارضی طور پر یہ ڈراما پلے کرنا ہوگا۔"

"کیا میں عیسائیت قبول کروں گی تو حملے کے اتحادی مجھے معاف کر دیں گے؟ مجھے بخش دیں گے؟"

"وہ کسی قیمت پر تمہیں معاف نہیں کریں گے۔ لیکن عیسائیت قبول کرتے ہی تم ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤ گی۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا میں انہیں دکھائی نہیں دوں گی؟"

"نہیں۔ عیسائی بننے والی عورتوں کو "کانونٹ" میں رکھا جاتا ہے۔"

"وہ کانونٹ بصرہ میں ہے؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہاں کسی مرد کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ وہاں نن بھی

ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھتیں۔ ہر نن کا آدھے سے زیادہ چہرہ گھونگھٹ جیسے نقاب کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ سب خدا کی خدمت کے لیے وقف ہوچکی ہوتی ہیں۔ انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھتا۔"

"کیا میرے شناختی کاغذات دیکھے بغیر' میری ہسٹری معلوم کیے بغیر مجھے وہاں قبول کیا جائے گا؟"

وہ بولا۔ "ریڈ کراس سوسائٹی اس لیے قائم کی گئی ہے کہ آفت زدہ علاقوں میں بھوک اور بیماریوں سے مرنے والوں کو روٹی کپڑا اور دوائیں دے کر انہیں ایک نئی زندگی دے کر عیسائی بنایا جائے۔ اول تو وہ عیسائی بننے والوں کے بارے میں چھان بین نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ کانونٹ میں ایک ملازمہ ہماری وفادار ہے۔ وہ بظاہر عیسائی ہے لیکن مسلمان ہے۔ وہ تمہاری مشکلیں آسان کرے گی۔"

وہ کانونٹ کے متعلق طرح طرح کے سوالات کرنے اور معلومات حاصل کرنے لگی۔ اس وقت جہاں تھی' وہ کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اتحادیوں سے بھرے ہوئے فوجی ٹرک ادھر سے گزرتے رہتے تھے۔ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس پناہ گاہ کو چھوڑنے سے پہلے اس طرف آنے والے فوجی ٹرکوں پر حملے کیے جائیں گے۔ پھر وہاں سے فرار ہو جائیں گے اور اس سے پہلے یاقوت کو کانونٹ کی چار دیواری میں پہنچا دیا جائے گا۔

☆☆☆

سارہ اور وسیم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے تھے۔ بیگم داؤد نے بیٹی اور داماد کو دعائیں دیں۔ پھر میاں بیوی کو ان کی خواب گاہ میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی کیونکہ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ حسب معمول محل کے دس ملازمین اپنی ڈیوٹی دینے والے تھے۔

تنہائی ملتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں سما گئے۔ بلکہ یوں جذب ہوگئے جیسے برسوں سے بچھڑنے کے بعد مل رہے ہوں۔ جیسے اندیشہ ہو کہ پھر بچھڑ نہ جائیں گے۔ اس لیے الگ نہیں ہو رہے تھے۔

مگر کیا کیا جائے' بار بار الگ ہونا پڑ رہا تھا۔ دروازے پر پھر دستک سنائی دی۔ انہوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ انہیں ایک دوسرے کو چھوڑنا پڑا۔ سارہ نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "جی میں ہوں۔ صفائی کے لیے آیا ہوں۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "ابھی میں سو رہی ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ جاؤ یہاں سے۔ صفائی کی ضرورت ہوگی تو بلالوں گی۔"

باہر خاموشی چھا گئی۔ وہ چلا گیا تھا۔ وہ وسیم کے پاس آکر سرگوشی میں بولی۔ "بڑی مشکل ہے۔ یہ تمام ملازم شام تک رہیں گے۔ ہمیں اٹھتے بیٹھتے... بھاگتے اور چھپتے رہنا ہوگا۔"

دوسرے پہلو سے ان کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ڈرا سہمے ہوئے تھے۔ دنیا والوں کے لیے مجرم تھے۔ ایسے چپ تھے جیسے بولنا بھول گئے ہوں۔ محل کا کوئی ملازم پھر سے اُدھر آسکتا تھا۔

ویسے کوئی نہیں آیا۔ بیگم داؤد نے ملازموں سے کہہ دیا تھا کہ سارہ بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' اسے سونے دیا جائے۔ آج اس کے کمرے کی صفائی نہ کی جائے۔

دوپہر کے دو بجے سارہ نے دروازہ کھول کر کھانا لانے کا حکم دیا۔ آدھے گھنٹے میں حکم کی تعمیل ہوگئی۔ کھانے کی ٹرالی آئی تو دروازہ پھر اندر سے بند ہوگیا۔

وہ دونوں ٹرالی کے اطراف بیٹھ گئے۔ ٹی وی کو دھیمی آواز میں آن کیا۔ خواب گاہ میں رہ کر باتیں نہیں کرسکتے تھے اس لیے خاموشی سے کھانے کے دوران حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھنے لگے۔

وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اس محل سے باہر عراق میں کیا ہو رہا ہے؟ ایسے ہی وقت پروگرام کے وقفے میں ان دونوں نے وسیم اور یاقوت کی تصویریں دیکھیں۔ انہیں خلاف توقع دیکھ کر چونک گئے۔

وسیم کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ اس نے خوش ہو کر یاقوت کو دیکھا۔ پھر بڑے جذبے سے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ "سارہ! یہ میری سسٹر ہیں۔"

وہ دونوں اسے دیکھنے اور اس کا پیغام سننے لگے۔ پس منظر سے کوئی خاتون کہہ رہی تھی۔ "یہ یاقوت العزیزی ہے اور یہ وسیم مصطفیٰ ہے۔ یاقوت اپنے اس منہ بولے بھائی کو تلاش کر رہی ہے۔"

وہ سارہ کی طرف جھک کر بولا۔ "یہ سچ مچ پریشان ہوں گی۔ مجھے تلاش کر رہی ہیں۔"

سارہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ "چپ رہو۔ سننے دو' کیا کہا جا رہا ہے؟"

کہا جا رہا تھا۔ "اگر وسیم دیکھ رہا ہے اور یہ پیغام سن رہا ہے تو اسکرین پر نظر آنے والے نمبر پر یاقوت سے رابطہ کرے۔"

وہ فوراً ہی نمبر پڑھنے اور یاد کرنے لگا۔ آگے کہا جا رہا تھا کہ وسیم کی طرح یاقوت کا گھر بھی اجڑ گیا ہے۔ اس کی بہن اور ماں باپ سب ہی ہلاک ہوگئے ہیں۔ وہ تنہا ہے اور اپنے وسیم کو پکار رہی ہے۔

ایسا جذباتی پیغام سن کر وہ تڑپ گیا۔ اس نے اشارے سے سارہ سے کہا۔ "میں ابھی فون کروں گا۔"

وہ سوچنے لگی۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر اس کے ساتھ واش روم میں آ کر بولی۔ ”تمہیں سسٹر کو تسلی دینا چاہیے کہ جہاں ہو، خیریت سے ہو لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مجھے اپنا فون دو۔“

”جلدی نہ کرو۔ سوچنے دو، کیا کسی طرح تمہاری فون کال پکڑی جاسکتی ہے؟“

”نہیں پکڑی جائے گی۔ اگر ڈرتی ہو تو کال کے بعد سم نکال دینا۔ تمہارے پاس دوسری سم بھی ہوگی۔“

”ہاں ہے۔ آئندہ میں دوسری استعمال کروں گی۔“

اس نے فون اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”یاد رکھو! فون پر بالکل نہ کہنا کہ یہاں چھپے ہوئے ہو۔“

”میں بھولے سے بھی تمہارا اور اس جگہ کا ذکر نہیں کروں گا۔“

اس نے اسکرین پر جو نمبر پڑھے تھے، انہیں پنچ کیا پھر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف گھنٹی جارہی تھی۔ کسی وجہ سے اٹینڈ کرنے میں دیر ہورہی تھی۔ وہ سسٹر کی آواز سننے کے لیے بے چین ہورہا تھا۔

داؤد اسرار اپنے آفس میں چند اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ بیٹھا باتیں کررہا تھا۔ ایک عورت تیزی سے چلتی ہوئی دستک دیے بغیر اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ کالنگ ٹون ابھر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”سر! یاقوت کے لیے کال ہے۔“

داؤد ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بے تابی سے بولا۔ ”فوراً اٹینڈ کرو۔“

اس عورت نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہیلو... کون؟“

وسیم نے بڑی محبت سے کہا۔ ”سسٹر! میں وسیم بول رہا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”ہائے وسیم! تم کہاں ہو؟ اپنی سسٹر کو بھول گئے ہو؟ میں تباہ و برباد ہوگئی ہوں۔ بالکل اکیلی ہوگئی ہوں۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک تم ہی میرا سہارا ہو۔ تم کہاں ہو؟ ابھی بتاؤ، ابھی دوڑی چلی آؤں گی۔“

”سسٹر! میں ایک جگہ چھپا ہوا ہوں۔ جیسے ہی یہاں سے نکلنے کا موقع...“

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ اس نے پوچھا۔ ”ہیلو! چپ کیوں ہوگئے؟“

اس نے پوچھا۔ ”آپ کی آواز کیسی ہے؟ مجھے کچھ مختلف لگ رہی۔“

وہ بولی۔ ”میں پچھلے ایک ہفتے سے اپنے گھر والوں کی موت کا ماتم کرتی رہی ہوں۔ بین کرتے رہنے سے آواز پھٹ گئی ہے۔ ذرا بدل گئی ہے۔“

وسیم نے فون پر ہاتھ رکھ کر سارہ کے کان میں کہا۔ ”یہ سسٹر نہیں لگ رہی ہے۔“

سارہ نے کہا۔ ”سسٹر کے بارے میں اس سے کوئی بات پوچھو۔“

اس نے فون پر ہاتھ ہٹا کر پوچھا۔ ”آپ یہ بتائیں، ہم بچھڑنے سے پہلے آخری بار کس جگہ تھے؟“

وہ بولی۔ ”یہ فون پر کیوں پوچھ رہے ہو؟ میرے پاس آؤ... یا مجھے بلاؤ۔ روبرو ہو کر جو پوچھنا چاہو، پوچھتے رہنا۔“

”آپ ابھی بتائیں، ہم اس رات کس حالت میں تھے اور کس طرح دیوار پھاند کر فرار ہوئے تھے؟“

”فار گاڈ سیک! اپنی سسٹر کا امتحان نہ لو۔ میں اکیلی ہوں۔ بے یار و مددگار ہوں۔ میرے کام آؤ۔“

”میں ابھی آپ کے پاس آؤں گا لیکن جو پوچھا ہے، پہلے اس کا جواب دیں۔“

”وسیم! میں تمہاری سسٹر یاقوت ہوں۔ مجھ سے بحث نہ کرو، مجھ پر شک نہ کرو۔“

اس نے فون بند کر کے سارہ سے کہا۔ ”یہ میرے اور سسٹر کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ ایک ہفتے پہلے ہم پر کیسی مصیبتیں آئی تھیں اور ہم کس طرح دیوار پھاند کر گھر سے نکل گئے تھے۔“

سارہ اس فون سے سم نکالتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں ڈھونڈ نکالنے کے لیے ایسی ہی حرکتیں کی جائیں گی۔ اب ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔“

دوسری طرف داؤد نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

اس عورت نے کہا۔ ”وہ یقین نہیں کررہا ہے کہ میں سسٹر یاقوت ہوں۔ اس نے فون بند کردیا ہے۔“

داؤد نے اس سے فون چھینتے ہوئے ایک اعلیٰ عہدے دار سے کہا۔ ”اس کا نمبر نوٹ کرو اور یہ معلوم کرو کہ...“

وہ بولتے بولتے نمبر پڑھ رہا تھا۔ حیرت کے مارے اچھل پڑا۔ فون کی اسکرین پر اس کے اپنے گھر کا، اپنی بیٹی کا نمبر دکھائی دے رہا تھا... کہ ہوس کدے میں آنے والا لڑکا فرار نہیں ہوا ہے۔ اس کے محل میں چھپا ہوا ہے۔

اور یہ کہ محل کے باہر سیکیورٹی منظم اور مستحکم ہے۔ وہ نکل نہیں پارہا ہے۔ کل سے وہاں کھاپی رہا ہے اور بیٹی کا فون بھی استعمال کررہا ہے۔

وہ غصے سے چیخ پڑا۔ ”کتے! میں تیری بوٹی بوٹی کتوں کو کھلاؤں گا۔ میں آرہا ہوں...“

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

حالات ہائے برہم

محی الدین نواب

عزائم انسان کے ہوں یا کسی بڑی عالمی طاقت یا کسی بڑی ریاست کے..... ان کے پیش نظر صرف اور صرف اپنا مفاد ہوتا ہے..... چاہے اپنے دیرینہ خواب اور تعیشات کی تکمیل کے لیے انہیں کیسا ہی طریقہ کارکیوں نہ اختیار کرنا پڑے..... ایسی ہی عالمی طاقتوں کا کھیل جو اپنی طاقت و مفادات کو قائم و دائم رکھنے کے لیے حالات میں بگاڑ پیدا کرکے انسانیت کو خس و خاشاک کی طرح روندتے جارہے تھے۔عالمی حالات کے تناظر میں رونما ہونے والی سیاسی فکری اور نظریاتی تبدیلیوں کی غماز.....

ناانصافیوں..... ناہموار زندگی کی مشکلات... یا... عشق جمال اور امن کے جذبوں کی عکاس

وہ لڑکا جو اس کے قدموں تلے آنے والا تھا، ایسے نکل گیا تھا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

داؤد اسرار اس بات پر تلملا رہا تھا کہ وہ چھوکرا پچھلے چوبیس گھنٹوں سے فرار ہونے کا جھانسا دے کر اس کے محل میں چھپ کر اسے اُلو بنا رہا تھا۔

اور وہ اس لیے بھی بھڑک گیا تھا کہ اس کی آواز بیٹی کے فون سے سنائی دی تھی۔ وہ بے اختیار پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا کہ اسے مار ڈالے گا۔ اس کی بوٹی بوٹی کتوں کا کھلا دے گا۔

اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ جہاں تھا وہیں سے گولی چلا کر وسیم کو مار ڈالتا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ یک لخت چپ ہوگیا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے دفتری کمرے میں کھڑا ہے اور دوسرے عہدے دار اس کا منہ تک رہے ہیں۔ ایک نے پوچھا۔ ”سر! کیا آپ نے فون نمبر سے معلوم کرلیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟“

داؤد نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ دوسرے عہدے دار نے پوچھا۔ ”سر! یہ کس کا فون نمبر ہے؟“

یہ سوال ایک جوتے کی طرح اس کے منہ پر لگا۔ وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس کی اپنی بیٹی کا فون نمبر ہے۔ اس سے بڑی ذلت اور توہین کیا ہوسکتی تھی کہ جس مجرم کو وہ گالیاں دے رہا تھا، وہ اس کی بیٹی کے پاس پایا جانے والا تھا۔ سننے والے تو یہی کہتے کہ جب فون اس کے پاس ہے تو بیٹی بھی اس کے پہلو میں ہوگی۔

وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس سے بڑی گالی اور کیا ہوسکتی تھی؟ وہ گالی اور غصے کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ وہ کہاں ہے یہ معلوم ہوچکا ہے۔ مجھے بہت ضروری طور پر وہاں جانا ہوگا... ورنہ وہ وہاں سے بھی بھاگ جائے گا۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا پولیس فورس تیار کی جائے؟“

وہ پاؤں پٹخ کر اپنی کرسی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں... بھیڑ اور ہنگامہ ضروری نہیں ہے۔ اسے گرفتار کرنے کے لیے میرے باڈی گارڈز ہی کافی ہیں۔ آپ لوگ جائیں۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔“

وہ سب وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے فون اٹینڈ کرنے والی جاسوس عورت سے کہا۔ ”تم بھی جاؤ۔ میری اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دینا۔“

اس نے باہر جاتے ہوئے دروازے کو بند کردیا۔ داؤد نے اپنے موبائل فون کے ذریعے اپنے محل کے ایک خسرے باڈی گارڈ کو مخاطب کیا۔ وہ آواز سنتے ہی مستعدی سے بولا۔ ”جی جناب عالی...!“

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟“

”خادم محل کے بیرونی دروازے پر ہے۔“

”کیا تم اندر کی خبر رکھتے ہو؟“

”جی جناب عالی! میرے ساتھ تین خواجہ سرا ہیں۔ ہم صبح سے شام کا اندھیرا ہونے تک محل کے اندر جاتے آتے رہتے ہیں اور ایک ایک بات کا دھیان رکھتے ہیں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ فرار ہونے والا لڑکا محل کے اندر نہیں ہے؟“

”نہیں ہے... جناب عالی! ہم نے محل کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے وارڈروب کے پیچھے اور اسٹور روم کے

کباڑ میں بھی اسے ڈھونڈا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ گیا ہے۔"
وہ غصہ پیتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "وہ فرار نہیں ہوا ہے، وہیں موجود ہے۔ میں نے یہاں سے اس کی موجودگی کو پالیا ہے۔"

اس کا آقا ایک ناقابل یقین بات کہہ رہا تھا لیکن وہ چپ تھا۔ اس کی بات کو جھوٹ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ پھر سرد لہجے میں بولا۔ "تم سب میرے وفادار ہو۔ تم لوگوں نے اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ وہاں موجود ہے اور کسی طرح تمہاری نظروں میں نہیں آرہا ہے۔"

"جناب عالی! آپ نے جس طرح اسے پالیا ہے اسی طرح ہماری راہنمائی کریں۔ ہم ابھی اس کی گردن دبوچ لیں گے۔"

وہ بولا۔ "وہاں اس کی موجودگی کا سراغ مل چکا ہے لیکن وہ کہاں چھپا ہوا ہے... یہ محل کے اندر جاکر معلوم کرنا ہوگا۔"

"میں ابھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر جاتا ہوں۔"

"نہیں۔ تم لوگ باہر رہو۔ اندر کسی کے کانوں میں ہلکی سی بھنک بھی نہ پڑے کہ ہم اچانک نئے سرے سے تلاشی شروع کرنے والے ہیں۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ تم سب میرے ساتھ اندر جاؤ گے۔"

"جی جناب عالی!" "ہم یہاں مستعد رہیں گے۔"

داؤد نے اس خسرے گارڈ کے بعد سیکیورٹی افسر سے رابطہ کیا۔ اسے بھی بتایا کہ وسیم محل کے اندر چھپا ہوا ہے پھر کہا۔ "خفیہ کیمروں کے ذریعے محل کے اندر نظر رکھو۔ وہ وہاں سے نکل کر باہر آسکتا ہے۔ اسے گولی نہ مارنا صرف زخمی کرنا۔ میں اسے کچلنا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر اس نے کہا۔ "میری بیوی... اور بیٹی کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں وہاں پہنچنے والا ہوں۔ انہیں ابھی اس معاملے سے بے خبر رکھو۔"

اس نے تمام سیکیورٹی گارڈز کو اور اپنے خاص خسرے گارڈز کو چوکنا کردیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ بیٹی نے وسیم سے کوئی تعلق رکھا ہوگا۔ صرف اس کا فون نمبر اسے الجھا رہا تھا اور شبہ پیدا کررہا تھا۔

سارہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یاقوت بن کر وسیم سے رابطہ کرنے والی اس کے پاپا کے شعبے سے تعلق رکھتی ہوگی اور اس جاسوس کے ذریعے اس کا موبائل نمبر باپ تک پہنچ گیا ہوگا۔

سارہ کو سوچنا سمجھنا چاہیے تھا کہ وسیم کے ساتھ فراڈ کرنے والی عورت کوئی دشمن ہوسکتی ہے۔ دشمنوں کی آلۂ کار ہوسکتی ہے۔ یوں اس کا فون نمبر دشمنوں تک پہنچ گیا ہوگا۔ لیکن وہ مختلف پہلوؤں سے سوچ نہ سکی کیونکہ سہاگ کا پہلا دن گزار رہی تھی۔ پہلی بار ایسی مسرتیں حاصل ہورہی تھیں جو اسے پَر کے بغیر پرواز کرا رہی تھیں۔ وہ اپنے بیڈروم کے باہر کی تمام دنیا بھلا چکی تھی۔

محل میں کام کرنے والے دس ملازمین حسب معمول صبح آئے تھے اور شام کو چلے گئے تھے۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ وسیم کی آغوش میں لپٹی ہوئی تھی۔ دونوں بہت ہی دھیمی سرگوشی میں بڑے پیار سے کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔

پھر وہ فوراً ہی الگ ہوکر اٹھ بیٹھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وسیم اسٹور روم میں جانے کے لیے بیڈ سے اتر گیا۔ پھر رک گیا۔ دوسری بار دستک کی آواز کے ساتھ بیگم داؤد کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

سارہ نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔ "کیا ملازم جاچکے ہیں؟"

"ہاں۔ اب کوئی نہیں ہے۔"

"کیا خواجہ سرا بھی جاچکے ہیں؟"

"ہاں۔ صرف ایک ہے۔ ایک گھنٹا پہلے یہوتی دروازے کے باہر کھڑا فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔"

"مام! وہ ادھر آسکتا ہے۔"

"نہیں آئے گا۔ میں نے تم دونوں کے لیے اسپیشل ڈشیں تیار کرائی ہیں۔ دروازہ کھولو۔ میں ٹرالی اندر کروں گی۔"

اس نے اتنا ہی دروازہ کھولا کہ ٹرالی اندر آجائے۔ بیگم داؤد نے وسیم کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے آئی پھر اسی طرح باہر چلی گئی۔ سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ ٹرالی سے لذیذ پکوان کی اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ کرسیاں لے کر ٹرالی کے اطراف بیٹھ گئے۔

سارہ نے کھانے کے دوران کہا۔ "مام نے ہماری شادی کی خوشی میں بہترین کھانا تیار کرایا ہے۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "بڑی دیر سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ کبھی کبھی میری بھی دائیں یا بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جب بھی میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے کوئی مصیبت ضرور آتی ہے۔"

"خوامخواہ ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ یہ دقیانوسی باتیں ہیں کہ آنکھ پھڑکنے سے کچھ اچھا یا برا ہوتا ہے۔"

انہوں نے ٹی وی اونچی آواز میں آن رکھا تھا تاکہ ان کی آواز دبی رہے باہر نہ جائے۔ سارہ نے کہا۔ "میں نے مام کی زبان سے سنا تھا' پرانے چھٹے ہوئے گناہ گاروں کو چھپ کر گناہ کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ دراصل کسی کو چوری چھپے حاصل کرو تو وہ بڑی پُراسرار بڑی پرکشش لگتی ہے۔ آئندہ بھی اسی طرح اسے حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

وسیم نے کہا۔ "ہم گناہ گار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود چھپ کر مل رہے ہیں۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔ بڑے سسپنس کے ساتھ رومانس ہورہا ہے۔"

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے چونک گئے، گھبرا گئے... جیسے کوئی آگیا ہو۔

کوئی نہیں آیا تھا۔ فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔ سارہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ سسپنس اور رومانس مزہ دے رہے تھے اور کلیجا بھی دھڑکا رہے تھے۔

اس نے فون کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ "ہیلو..."

دوسری طرف سے ماں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "سارہ! تمہارے پاپا اچانک آگئے ہیں۔ میں نے بالکونی سے دیکھا ہے۔ وہ اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے بڑے گیٹ سے اندر آئے ہیں۔ سنبھل جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔"

اب اسے معلوم ہوا کہ ہوش کیسے اڑتے ہیں؟ اس نے گھبرا کر وسیم کو دیکھا۔ اگر دھیمی آواز میں چیخ سکتے ہیں تو وہ چیخ کر بولی۔ "وہ آگئے ہیں... پاپا آگئے ہیں۔ بھاگو... م... میرا مطلب ہے... وہاں جاکر چھپ جاؤ۔"

وہ دونوں دوڑتے ہوئے باتھ روم میں آئے۔ وسیم دروازہ کھول کر اسٹور روم میں جانے لگا تو وہ بولی۔ "چپ رہنا۔ کوئی آہٹ نہ ہو۔ جب تک میں یہ نہ بولوں کہ میں تمہاری شریک حیات ہوں، تب تک دروازہ نہ کھولنا۔"

وہ وہاں بند ہوگیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔ بیڈ پر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں وسیم کی موجودگی کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ شبہے میں مبتلا کرنے والی شکنیں بستر پر نہیں تھیں۔ محبوب کے سر سے ٹوٹا ہوا ایک بال بھی نہیں تھا۔ دل یقین سے کہہ رہا تھا کہ باپ چوری نہیں پکڑے گا۔

اس نے ٹرالی کے پاس آکر وسیم کے جھوٹے برتن کو ٹشو پیپر سے صاف کیا پھر دروازے کے لاک کو اندر سے ہٹادیا۔ چھ خواجہ سرا اور دس سیکیورٹی گارڈز داؤد کے ساتھ اندر آگئے تھے اور بڑی تیزی سے محل کے ہر حصے کونے کھنگال رہے تھے۔

داؤد غصہ برداشت نہیں کرپا رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا سیدھا بیٹی کے کمرے کے سامنے آیا۔ پھر اس نے دروازے کو ایک لات ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے پوری طرح کھل گیا۔ سارہ سہم کر سانس لینا بھول گئی۔ باپ کے اس انداز نے سمجھا دیا تھا کہ وہ دشمن بن کر آیا ہے۔

وہ اندر آتے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر گرجتے ہوئے بولا۔ "تمہارا فون کہاں ہے؟ مجھے دو۔"

فون کے مطالبے نے اسے مزید سمجھا دیا کہ بات بگڑ چکی ہے۔ بھید کھلنے والا ہے۔ وہ بوکھلا کر فون کو ادھر ادھر ڈھونڈنے لگی۔ وہ پھر گرجنے لگا۔ "کہاں ہے فون؟ کم آن گیوات نوی۔ ہری اپ۔"

فون کھانے کی ٹرالی پر رکھا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ادھر گئی پھر اسے اٹھا کر لے آئی۔ داؤد نے اسے جھپٹنے کے انداز میں لیا پھر کہا۔ "وہ کتا اسی فون سے بول رہا تھا۔ کہاں ہے وہ؟"

بیگم داؤد بھی وہاں آگئی تھی۔ دروازے پر رک کر باپ بیٹی کی باتیں سن رہی تھی۔ سارہ ذرا حوصلے سے بولی۔ "پاپا! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آتے ہی بیٹی کو غصہ دکھا رہے ہیں۔ کوئی کتا میرے فون سے کیسے بولے گا؟"

"میں اُس کتے کی بات کررہا ہوں جو وسیم بن کر یہاں آیا تھا۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے، یہیں اسی محل میں ہے اور تمہارا فون استعمال کررہا ہے۔"

سارہ نے پوچھا۔ "کیا اس نے میرے اس فون سے آپ سے بات کی ہے؟"

"ہاں۔ وہ ہماری ایک جاسوس کو اپنی سسٹر سمجھ کر بول رہا تھا۔"

سارہ نے کہا۔ "اوہ گاڈ! وہ میرے فون کی سم استعمال کررہا ہے۔ میں نے کل آپ کے جانے کے بعد سم بدل دی

پیانو

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے لیے ائرپورٹ پر پہنچا تو دلہن نے اپنے شوہر سے کہا۔ "کاش ہم اپنا پیانو بھی ساتھ لے آتے۔"

"پیانو؟" شوہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "بھلا پیانو ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟"

"جہاز کے ٹکٹ پیانو پر رکھے ہوئے تھے۔" دلہن نے جواب دیا۔

تھی۔ پرانی ہم کو پانچ ہزار دینار کے ساتھ تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ سوچا تھا کسی وقت اسے دراز میں رکھ دوں گی۔''

پھر اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر کہا۔ ''رات کو سونے سے پہلے تکیہ ہٹایا تو یہاں بم اور نقد رقم نہیں تھی۔ میں نے یہ بات ماں کو بتائی تھی۔''

بیگم نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سوچا، سارہ کہیں رکھ کر بھول گئی ہے۔ ہم نے الماری کی، ٹی وی ٹرالی کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں دیکھا تھا۔ نہ وہ بم ملی اور نہ دینار۔''

سارہ نے کہا۔ ''یہی بات سمجھ میں آئی کہ وہ فرار ہونے والا بم سمیت رقم لے گیا ہے۔''

بیگم نے کہا۔ ''ہم نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے کال کی تھی لیکن فون انگیج جا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ آپ آئیں گے تو یہ بات بتا دیں گے۔''

تین خواجہ سرا اندر آگئے تھے۔ وہ بیڈ کے نیچے، الماری کے پیچھے دیکھنے کے بعد اسٹور روم اور باتھ روم میں گئے۔ وہ پہلے بھی وہاں جا چکے تھے۔ اسٹور روم کے بڑے بڑے بھاری سامان نے پھر یہی سمجھایا کہ کوئی پہلوان بھی اکیلا انہیں ہٹا کر ان کے پیچھے نہیں جا سکتا اور باتھ روم سے کھلنے والا دروازہ ہمیشہ اندر سے بند رہتا ہے۔

داؤد نے جھنجلا کر ان خسروں سے کہا۔ ''نکلو یہاں سے... میرے ساتھ آؤ۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس راستے سے فرار ہوا ہے۔''

وہ ان کے ساتھ محل سے باہر آگیا۔ سیکیورٹی افسر اور دوسرے گارڈز بھی ساتھ ہوگئے تھے۔ ہر سمت احاطے میں بلب روشن تھے۔ دور تک دیکھنے کے لیے سرچ لائٹس بھی تھیں۔ سیکیورٹی افسر داؤد کو بتا رہا تھا کہ گارڈز دو دو کی ٹولی بنا کر احاطے کی دیواروں کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور دوسری طرف سے دوسرے گارڈز آتے ہوئے انہیں کراس کرتے رہتے ہیں۔

پھر یہ کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے چھوٹی وی اسکرینز پر محل کے اندر اور باہر کا منظر دیکھا جاتا ہے۔

ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ وسیم دن کی روشنی میں فرار ہوا تھا۔ احاطے کی دیواروں کے ساتھ کئی گھنے درخت تھے۔ یہی رائے قائم کی گئی تھی کہ وہ گارڈز سے نظریں بچا کر کسی درخت کے ذریعے اونچی دیواروں کے پار گیا ہوگا۔

سارہ نے بم کے چوری ہونے کی بات جس انداز میں بتائی تھی، وہ بن گئی تھی۔ داؤد کا یہ شبہ دور ہوگیا کہ بیٹی نے اسے چھپا کر رکھا ہے۔ اب وہ اس کی خواب گاہ کی طرف آنے والا نہیں تھا۔ بیگم داؤد کے اسٹور روم، باتھ روم اور بیڈ روم میں بھی اسے تلاش کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ نظر نہیں آرہا تھا، ایک کانٹے کی طرح دماغ سے نکل گیا تھا مگر پھانس کی طرح کھٹک رہا تھا۔

وہ مطمئن ہونے کے باوجود غیر شعوری طور پر الجھا ہوا تھا۔ کیا کرتا...؟ کانٹا آسانی سے نکل جاتا ہے، پھانس نکلنے کا نام نہیں لیتی۔

وہ حرم سرا کے عیش کدے میں آکر بیٹھ گیا۔ اس رات وہاں صرف شراب تھی، پی کر بہکنے کا سامان نہیں تھا۔ پھانس نکالنے والی نہ کوئی تھی، نہ کوئی تھا۔ وہ ڈنر سے پہلے وائن پیتا تھا۔ اس نے ایک گلاس بنا کر ابو ولاد سے فون پر کہا۔ ''میں خالی بیٹھا ہوں۔ کوئی اچھی چیز بھیجو۔''

اس نے کہا۔ ''سر! میرے اڈے پر گولیاں چل رہی ہیں۔ میں وہاں سے بہت دور ہوں۔ ابھی تو کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد کچھ کر سکا تو کال کروں گا۔''

اس نے لعنت بھیج کر فون بند کردیا۔ وہ باہر کی مصروفیات سے فراغت کے بعد محل میں آکر راتیں رنگین کرنے کا عادی تھا، تب ہی اس کی تھکن دور ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وسیم پکڑا جائے گا تو اسے باندھ کر اس کی مرمت بھی کرے گا اور خرمستیاں بھی کرتا رہے گا۔ ہر رات اس سے انتقام لیتے رہے گا۔ جب بیزار ہو جائے گا تو اسے گولی مار کر کہیں پھنکوا دے گا۔

مگر حسرت ہی رہ گئی۔ وہ ہاتھ کیا آتا، نظر تک نہیں آیا۔ رت جگا منانے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ بیگم داؤد رات کا کھانا ٹرالی میں لے کر آئی اور کہا۔ ''آج تو اس عیش کدے میں کوئی نہیں ہے۔ کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتی ہوں؟''

''ہاں... بیٹھو۔ آج میں بالکل... اکیلا ہوگیا ہوں۔ سارہ کو بھی بلا لو۔''

''آپ بیٹی کو کبھی حرم سرا میں آنے نہیں دیتے، اسے نہ بلائیں۔ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہ کھانے کے بعد سونے گئی ہے۔''

وہ پینے کے دوران تھوڑا بہت کھاتا رہتا تھا۔ پیٹ میں خوراک سے زیادہ شراب جاتی...... تھی۔ اس نے نشہ تیز کرنے کے لیے بیگم سے کہا۔ ''بلیک لیبل کی کوئی بوتل کھولو اور پیگ بناؤ۔''

بیگم نے حکم کی تعمیل کی۔ بہت عرصے بعد اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہوئے ساقی کا فرض ادا کرنے لگی۔ اس کے اندر بھٹکنے والے جذبات کہہ رہے تھے کہ شاید مجازی خدا آج مہربان ہوگا۔

وہ پی رہا تھا اور برائے نام کھا رہا تھا۔ بیگم نے پوچھا۔ ''آج آپ کی رات کیسے گزرے گی؟''

داؤد نے تیسرا پیگ ختم کر کے اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور دو... میں اتنا پیوں گا کہ کسی کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ میں مدہوش ہو جاؤں گا۔ نہ کوئی ہوگی، نہ نظر آئے گی۔ رات گزر جائے گی۔''

وہ ایک حساس عورت تھی۔ اپنی توہین برداشت کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا میں آپ کو بھی نظر نہیں آؤں گی؟''

اس نے ہنستے ہوئے چوتھے پیگ کو منہ سے لگایا۔ پھر دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ''جس طرح بڑھاپے کے لیے سرمایہ بچا کر رکھا جاتا ہے، اسی طرح تمہیں سنبھال کر رکھا ہے۔ تم بڑھاپے میں کام آؤ گی۔''

اس نے جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تھوڑی تھوڑی سی چھلک رہی ہو۔ یہ شراب کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ چلو اور پلاؤ۔''

پانچواں گلاس بھر گیا پھر خالی ہوگیا۔ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ ''یہ شراب بھی کیا جادو دکھاتی ہے؟ کھوٹے سکے کو چمکا دیتی ہے۔ ارے میری جان! تم تو چمک رہی ہو۔''

بیگم پوری چمک دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے خالی گلاس کو بھر دیا۔ وہ اسے ایسے چھو رہا تھا جیسے پہلی بار دریافت کر رہا ہو۔ اس نے قریب ہو کر گلاس پیش کیا۔ بے چاری برسوں کے بعد جذبات سے کانپ رہی تھی۔ اس نے گلاس لیا پھر دو گھونٹ پینے کے بعد اسے پکڑنے لگا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔ ''ارے! تم تو قیامت ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بیگم آکر بیٹھی ہے۔ لعنت ہے... کہاں تم اور کہاں وہ...''

وہ نشے میں بہک رہا تھا۔ شریک حیات پر لعنت بھیج رہا تھا۔ عورت اپنی توہین برداشت نہیں کرتی لیکن وہ اس امید پر برداشت کر رہی تھی کہ برسوں کی آگ بجھائے گا۔ گالی دے رہا تھا، وہ اس کی تنہائی دور کرے گا۔

اور ایسا ہو رہا تھا۔ اسے کھویا ہوا سہاگ مل رہا تھا۔ اگرچہ وہ نشے میں کسی اور سے بہل رہا تھا لیکن وہ پورے ہوش و حواس میں اپنے شوہر کو پا رہی تھی۔

کوئی کتنا ہی بدنصیب کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی اس کے دن پھرتے ہیں۔ بیگم داؤد کی رات پھر آئی تھی۔ وہ سوچ رہی

تھی؟ کیا کرے؟ اسے کیسے دیوانہ کردے کہ یہ رات بار بار آتی رہے؟

پھر وہ اچانک ہی گڑبڑا گئی اور پریشان ہوکر بولی۔ ”یہ... یہ کیا کررہے ہیں؟“

نشے کے باعث زبان میں لکنت آگئی تھی۔ وہ بولا۔ ”وہی کررہا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔“

”میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے شوق پر۔“

تڑاخ کی آواز کے ساتھ منہ پر طمانچہ پڑا۔ ”سالی! چپ کر...“

”نہیں۔ میں چپ نہیں رہوں گی۔ یہ خلافِ فطرت ہے۔ یہ ازدواجی محبت نہیں ہے۔ وحشت ہے... حیوانیت ہے۔“

وہ اسے ماررہا تھا۔ اسے زیر کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”خدا سے ڈرو۔ اٹھارہ برسوں کے بعد آئے ہو۔ میں انسان ہوں۔ میرے جذبات کو سمجھو۔ مجھے وسیم نہ سمجھو۔“

پھر ایک الٹا ہاتھ منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ”وہ کتا تھا۔ بھاگ گیا۔ تو وسیم ہے... تو نے بہت دوڑایا ہے۔ تجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ دروازہ کل بند کرکے جاتا تو کبھی بھاگ نہ پاتا۔ اب کہاں جائے گا... بول؟“

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”مجھے بھاگنا ہوتا تو برسوں پہلے طلاق لے لیتی۔ لیکن کیا کروں؟ یہاں جیسے گزر رہی ہے ویسے گزار رہی ہوں۔“

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”جو بھی نیا وسیم آتا ہے اسی طرح دوڑاتا ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے۔“

وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ بیگم نے ایک گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ اور پیتے رہیں۔ مدہوش ہوجائیں۔ سو جائیں... یہی بہتر ہے۔ مجھے اپنی بدنصیبی پر رونے کی عادت ہوگئی ہے۔ میں تو روتی ہی رہوں گی۔“

اس نے گلاس پر ایک ہاتھ مارا۔ وہ دور جاکر دیوار سے ٹکرایا پھر اس کے کئی ٹکڑے دور تک بکھر گئے۔

ایسے ہی وقت بجلی چلی گئی۔ سوئچ بورڈ سے لگی ہوئی چارجر لائٹ آن ہوگئی۔ داؤد نے آگے بڑھ کر اسے دبوچتے ہوئے کہا۔ ”سالے! میری بیٹی کے فون سے بولتا ہے۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی...“

بیگم داؤد نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑالیا۔ ایسے وقت اس کا ہاتھ داؤد کے منہ پر پڑا تو وہ بھنا گیا۔ ”کتے! تو نے مجھے طمانچہ مارا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس نے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ شراب چڑھ گئی تھی۔ کھوپڑی الٹا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ”میں وہ نہیں ہوں۔ آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ اسے ہٹائیں۔ گولی چل جائے گی۔“

”نہیں چلے گی۔ جو کہتا ہوں وہ کر...“

وہ دروازے کی طرف بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ”میں سیکیورٹی گارڈز کی طرح اندھا نہیں ہوں۔ تجھے بھاگنے نہیں دوں گا۔“

بیگم نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جاکر فرش پر گر پڑا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وسیم اس کے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ نشے میں حیوان بن رہا ہے، صبح انسان بن جائے گا۔

وہ دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ فرش سے اٹھتے اٹھتے پھر ڈگمگا گیا۔ اس نے دوسری بار گرتے ہی ریوالور والا ہاتھ اٹھایا پھر چیخ کر کہا۔ ”پکڑو... یہ پھر بھاگ رہا ہے۔ اسے جانے نہ دو۔“

رات کے سناٹے میں ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ گولی چلی۔ بیگم داؤد دروازہ کھول چکی تھی۔ اسی وقت اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ منہ کھل گیا، دیدے پھیل گئے۔ پھر وہ دروازے سے لگ کر بیٹھے بیٹھے فرش پر چاروں شانے چت ہوگئی۔

وہ اُدھر پڑی تھی، یہ اِدھر پڑا تھا۔ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے شیر مارا ہو۔ نشہ اس قدر حاوی تھا کہ فرش پر سے اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر اس کے فون سے کالنگ ٹون چیخنے لگی۔ ”کون ہے؟“

وہ اپنے لباس کو ٹٹولنے لگا۔ پھر فون کو پاکر بولا۔ ”سالا! یہ چیخ رہا ہے۔“

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے پرسنل خسرے گارڈ کی آواز سنائی دی۔ ”سر! ہم نے فائر کی آواز سنی ہے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟“

وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ”وہ کتا بھاگ رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھائیں کردیا ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔“

خسرے گارڈ نے فون بند کردیا۔ اس کے پاس مقفل دروازے کی ایک چابی رہتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر کئی سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ اندر آیا۔ وہ سب حرم سرا میں آئے۔ پھر بیگم کی خون آلود لاش دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

سیکیورٹی افسر اور کئی گارڈز داؤد کے پاس آئے۔ وہ فرش پر سے اٹھ رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے سہارا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اس کتے کی لاش کو کہیں دور لے جاکر پھینک دو۔“

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ”سر! آپ نے اپنی وائف کا مرڈر کیا ہے۔“

”آں...؟“

اس نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے دیکھا۔ آنکھیں میچ کر کھولیں۔ سر جھٹک کر دیکھا۔ حیران ہوکر کہا۔ ”یہ تو میری بیوی ہے... وہ کہاں ہے؟“

ایک خسرہ گارڈ فریج کھول کر لیمن جوس نکال کر لایا۔ اسے پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”سر! اسے پی لیں۔ ہوش میں آئیں۔ معاملہ سنگین ہے۔ ہمیں بتائیں، کیا کرنا ہے؟“

وہ لیمن جوس کا بھرا ہوا گلاس منہ سے لگا کر پینے لگا۔ کچھ سمجھ آرہی تھی کہ معاملہ گڑبڑ ہوگیا ہے۔ یہ یاد آرہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے بیگم سے ہاتھا پائی ہورہی تھی۔

اس نے گلاس خالی کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ حاضر دماغ رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے دوسرا گلاس پیش کیا گیا۔ وہ اسے بھی پینے لگا۔ سیکیورٹی افسر اور تمام گارڈز اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔

اس نے دوسرا گلاس خالی کرنے کے بعد کہا۔ ”اس مرڈر کی ہسٹری بناؤ۔ دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ محل میں گھس آئے تھے۔ ایسے وقت بجلی گئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں میری وائف ماری گئی۔ سارہ کو بھی یہی معلوم ہونا چاہیے۔“

سارہ بند کمرے میں وسیم کے ساتھ تھی۔ انہوں نے فائر کی آواز سنی تھی۔ ایک ذرا سی اُلجھن ہوئی کہ محل کے اندر گولی کیوں چلی ہے؟ کس نے چلائی ہے؟

رات کے سناٹے میں محل کے فرش پر بھاری بھرکم جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ وہ بولی۔ ”وسیم! اٹھو... اسٹور روم میں جاؤ۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید پاپا ادھر آئیں گے۔“

وہ چھپنے کے لیے اسٹور روم میں چلا گیا۔ سارہ اپنی مام سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ محل میں کیا ہورہا ہے؟ اس نے بیگم داؤد کا فون نمبر پنچ کیا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے بیل کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ فون بیگم داؤد کے بیڈ روم میں تھا۔ وہاں کوئی اسے اٹینڈ کرنے والا نہیں تھا۔

سارہ نے فون بند کردیا۔ اسی وقت مسلسل فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بیگم کی مرڈر ہسٹری کے مطابق دہشت گرد محل میں گھس آئے تھے۔ وہاں کی دیواروں، دروازوں، کھڑکیوں اور الماریوں پر گولیوں کے نشانات ثابت کرنے والے تھے کہ محل میں حملہ ہوا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ ہورہی تھی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقت گزر گیا۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

ایک خسرے گارڈ نے پوچھا۔ ”آپ خیریت سے ہیں؟“

”ہاں۔ خیریت سے ہوں۔ یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟“

”دہشت گرد محل میں گھس آئے تھے۔ ہم نے انہیں مار بھگایا ہے۔ لیکن...“

اس نے پوچھا۔ ”لیکن کیا...؟“

”آپ دیکھ رہی ہیں، ہر طرف اندھیرا ہے۔ آپ کی مام فائرنگ کی زد میں آگئیں۔“

سارہ نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کہاں ہیں میری مام...؟“

خسرے گارڈ نے اناللہ... پڑھا۔ وہ چیختی ہوئی دروازہ کھولتی ہوئی باہر آئی۔ گارڈ نے اسے چارجر لائٹ کی روشنی میں وہاں پہنچا دیا۔ اس نے ماں کی خون آلود لاش دیکھی پھر فرش پر گر کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

یاقوت نے کبھی اُدھر سے گزرتے ہوئے راہباؤں کے اس مسکن کو دیکھا تھا۔ پہلی بار وہ قریب آئی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر اس کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔

وہ کانونٹ چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کی اونچائی پر تھا۔ شہری آبادی سے دور، دنیا سے الگ تھلگ لگتا تھا۔ وہ ایک راہبہ میریا کے ساتھ چلتی ہوئی دائیں بائیں سر گھماتے ہوئے اس اجنبی پُراسرار ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ پناہ لینے کے لیے ایک نئی دنیا میں آگئی تھی۔

ایک صدی سے کچھ پہلے مشرقِ وسطیٰ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے وہ وسیع و عریض چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ وہاں دینی قواعد و ضوابط پر بڑی سختی سے عمل کرایا جاتا تھا۔ طریقۂ عبادت کے مطابق روحانی مشقوں کے علاوہ سخت احاطہ بندی تھی۔ کوئی نن اس عمارت کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی اور کوئی مرد باہر سے جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔

وہاں مراقبہ، نفس کشی، یوگا اور خاموشی لازمی تھی۔ راہباؤں کو آپس میں بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی اہم معاملے میں وہ مدر سے رجوع کرتی تھیں۔ مدر کے علاوہ وہ ایک فادر اور ایک راہب تھا جو زندگی کی ضروریات کا تمام سامان کانونٹ میں لاتا تھا۔

وہ جس راہبہ کے ساتھ آئی تھی، اس کا نام بھی جمائلہ تھا۔ اب وہ میریا ہوگئی تھی۔ مذہب بدل گیا تھا۔ یاقوت کی بھی دین و دنیا اور نام بدلنے والا تھا۔

ایک آفس میں مدر مارتھا دوراہباؤں کو وہاں کے کسی معاملے میں ہدایات دے رہی تھی۔ میریا نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ ''مدر! یہ وہی لڑکی ہے۔''

ریڈکراس سوسائٹی کے ایک ایجنٹ نے مدر کو یاقوت کے متعلق پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ حالات کی ستائی ہوئی لڑکی ہے۔ دل سے عیسائیت قبول کر کے وہاں کے قوانین اور اصولوں کے مطابق زندگی گزارے گی۔

مدر نے یاقوت پر ایک نظر ڈالی پھر اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ زیادہ نہیں بولتی تھی۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ اس نے پیچھے آ کر جو کام کیا' وہ بالکل ہی یاقوت کی توقع کے خلاف تھا۔

اس نے ''کچاک'' کی آواز کے ساتھ ہی قینچی کے چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ریشمی زلفیں کٹنے اور چھوٹی ہونے لگیں۔ کلیجے سے ''ہائے'' نکلی۔ اُسے یاد آیا' اس کے محبوب حارث نے ریشمی گھنی زلفوں میں ڈوب کر پہلی بار اس کی گردن کا بوسہ لیا تھا۔

اب اسے یاد آ رہا تھا کہ نن بننے والی عورتوں کے سر پہ بال نہیں رہتے یا پھر ناخن برابر رہتے ہیں۔ وہاں کانونٹ میں آئینہ نہیں تھا۔ ورنہ وہ دیکھتی کہ کالے بادلوں کے چھٹنے کے بعد چاند سا مکھڑا کیسا اُلجھے ہوئے انڈے جیسا لگے گا؟

اسے وہاں کا مخصوص لباس پہننے کے لیے دیا گیا۔ وہ لباس چرچ میں موجود باقی تمام چیزوں کی طرح صدیوں کی روایات کے مطابق تھا۔ ایک ڈھیلا ڈھالا سوتی لبادہ' چوڑی آستینیں جن میں انگلیوں اور ہتھیلیوں کو چھپا کر رکھنا پڑتا تھا۔

مدر نے ہدایات دیں۔ ''تمہیں اپنا سر جھکا کر چلنا ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کو لباس کے اندر رکھو۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاؤ۔ آہستہ چلو۔ کبھی کسی سسٹر سے نظریں نہ ملاؤ۔ نہ کسی سے بولو نہ کسی کی سنو۔ تمہارے کان صرف خدا کے الفاظ سننے کے لیے ہیں۔''

اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''جی معزز مدر!''

''جو یہاں آتی ہیں' وہ دوسروں کے ساتھ رہنے نہیں آتیں۔ خدا کی تلاش میں آتی ہیں اور اس کو پانے کے لیے ...... تنہائی بہت ضروری ہے۔''

''جی معزز مدر!''

''تمہیں ہمیشہ آنکھوں کی خاموشی کا پابند رہنا ہوگا۔ دوسروں کی آنکھوں میں جھانکنے سے تمہارے دماغ میں بیکار تصورات جنم لیں گے جو تمہاری توجہ کو منتشر کریں گے۔''

''جی معزز مدر!''

''جو سب سے پہلا سبق تم یہاں سیکھوگی' وہ ماضی کے ہر تصور کو دماغ سے نکال پھینکنا ہے۔ خود کو اپنی چاہت اور اپنی محبت سے باز رکھنے کے لیے اپنا احتساب کرو اور توبہ کرتی رہو۔ تمہیں اپنے احساسات اور جذبات سے جنگ لڑنی ہوگی۔''

''جی ہولی مدر!''

''ہر نن خاموش اور تنہا رہتی ہے۔ ایسے جیسے وہ جنت میں پہنچ چکی ہو۔ اس شفاف اور نایاب خاموشی میں جس کی وہ بھوکی ہوتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ لامتناہی خاموشی کو سن سکے اور خدا کو پالے۔''

وہ بظاہر اس کی ہدایات کو تسلیم کر رہی تھی اور دل ہی دل میں بیزار ہو رہی تھی۔ اسے بیزاری کے باوجود وہاں کی ایک کال کوٹھری جیسے کمرے میں رہنا تھا۔ اس کمرے میں سونے کے لیے تخت اور بیٹھنے کے لیے سیدھی پشت کی ایک کرسی تھی۔ ایک چھوٹا سا ٹب' جگ اور صابن ایک کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں کسی نن کو کسی دوسری نن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ قید خانہ اس لحاظ سے اہم اور اطمینان بخش تھا کہ وہاں عورتیں محفوظ تھیں۔ پورے عراق میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ وہاں کوئی انہیں چھونے کے لیے بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وحشیوں کی بستی میں آبرو کا سرمایہ محفوظ تھا۔

1979ء میں جب صدام حسین صدر کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آیا تو سیاسی حالات ابتر ہونے لگے۔ اس پہلو پر کسی نے توجہ نہیں دی کہ اس دور سے کانونٹ میں نن بننے والی عورتوں کا اضافہ ہوتا آ رہا ہے۔ ایسی عورتوں کا اضافہ جو پہلے مسلمان تھیں۔

اس تلخ حقیقت کا پس منظر یہ ہے کہ اس دور میں ہر سو صدام حسین کے مخالفین تھے۔ شمال میں کرد قوم اپنے جائز حقوق کے مطالبات کر رہی تھی جنہیں تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ جنوبی علاقوں میں اس کی مخالفت کرنے والے شیعہ غالب اکثریت میں تھے۔

ایسے وقت اس نے اسلامی جمہوریہ ایران سے جنگ چھیڑ کر بہت بڑی سیاسی غلطی کی۔ 1980ء میں جنگ شروع کی گئی اور 1982ء میں عرضِ ایران سے شکست کھا کر واپس آنا پڑا۔

پھر اس نے 1990ء میں کویت پر حملہ کر کے دوسری بڑی سیاسی غلطی کی۔ اسے ایک سال کے اندر ہی فتح کے باوجود شکست تسلیم کرنی پڑی۔ اس دوران وہ اقتصادی اور عسکری طور پر کمزور ہوتا گیا۔ عوامی سطح پر بیروزگاری' غربت اور محتاجی بڑھتی گئی۔ ریڈکراس ٹیم کے ایجنٹ مسلمان تعلیم یافتہ' آفت زدہ عورتوں کو روٹی' کپڑے اور نئی زندگی کے عوض عیسائیت کی طرف مائل کرنے لگے۔

2003ء میں امریکا' برطانیہ اور یورپ کے دیگر اتحادیوں نے عراق پر حملہ کیا تو ملک میں اقتصادی بدحالی اور بیروزگاری کے باعث قتل و غارت گری' ڈکیتی' اغوا' ٹارگٹ کلنگ اور خودکش حملوں میں اضافہ ہوگیا... جیسے قیامت آگئی ہو' آخری وقت ہو اور یہ قیامت پورے عراق کو نابود کر کے ہی جائے گی۔

عراق میں جو طوائف الملوکی رہی، اس کے نتیجے میں جرائم کی تعداد بڑھی۔ لڑکے لڑکوں کی خرید و فروخت اور بے حیائی کے کام جاری رہے۔ ان حالات میں بھوک سے' موت سے اور گناہوں سے بچنے والوں کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ عیسائیت کی چھاؤں میں چلے آئیں۔

جہاں یاقوت پہنچی' وہاں ایسی ہی مسلمان عراقی عورتیں تھیں جو اب مسلمان نہیں رہی تھیں۔ جیسا کہ وہ دیکھ رہی تھی' وہ دین سے گئی تھیں لیکن ان سب کی شرم و حیا سلامت تھی۔

کانونٹ میں وہ پہلی رات تھی۔ وہ نیم تاریکی میں کوٹھری کے تخت پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔ 'حارث بھی ایسی ہی کال کوٹھری میں ہوگا۔ اسے سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ وہاں زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہوگا اور میں یہاں نئی زندگی کا ہاتھ تھامنے آئی ہوں۔

ہم پیار کرنے والوں کا یہ نصیب کیسا ہے؟ ہم زیادہ کچھ نہیں مانگتے۔ پیار کرنے کے لیے صرف کھلی فضا اور آزادی کی آرزو ہے۔ اتنی ہی آرزو پوری نہیں ہوتی۔

ہمارے مجاہدین کہہ رہے تھے۔ حارث، دی لائن آف اللہ بریگیڈ کا ایک فولادی ستون ہے۔ اسے مرنے نہیں دیں گے۔ دشمنوں کو سزائے موت پر عمل نہیں کرنے دیں گے۔ اسے زنداں سے نکال لانے کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے۔'

وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔ ''یا خدا! مجاہدین کے عزائم پورے کر دے۔ وہ زندہ سلامت آئے گا تو میں خوشی سے مرجاؤں گی۔ بے شک... میں مرجاؤں میرے معبود... اسے زندہ رہنے دے۔''

وہ سوچ رہی تھی اور کروٹیں بدل رہی تھی۔ پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کیا۔ ایک ہلکی سی کھٹ کی آواز سنائی دی.... رات کو دس بجے کے بعد لائٹ آن رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ پورے کانونٹ میں گہری تاریکی چھا جاتی تھی۔ تمام کوٹھریاں اور دفتری کمرے کی لائٹیں بجھ جاتی تھیں۔

وہ گہری تاریکی میں تھی۔ اس نے سرہانے ہاتھ بڑھا کر ایک سوئچ کے بٹن کو دبایا۔ زیرو پاور کی دھیمی سی روشنی ہوگئی۔ اس نے اُدھر دیکھا۔ اس دروازے پر ایک ہتھیلی بھر کی چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے چھوٹے سے پٹ کو کھول کر دیکھا جاتا تھا کہ کون آیا ہے؟

زیرو پاور کی پُراسرار روشنی دروازے کے نچلے حصے سے باہر گئی ہوگی۔ آنے والے کو معلوم ہوگیا کہ کال کوٹھری والی جاگ رہی ہے۔ باہر سے پھر ایک کھٹ کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں کے اصول کتنے سخت ہیں۔ ایک نن کو دوسری نن سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ کوئی کسی کے دروازے پر نہیں آتی تھی پھر اتنی رات کو کون آیا تھا؟

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد جواباً ویسی ہی دستک سنائی دی۔ یہ یقین ہوا کہ باہر کوئی ہے۔

وہاں کسی سے ملنے اور بات کرنے پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انہوں نے دل سے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا ہے۔ خدا اور ابنِ مریم سے منسوب ہونے والے اگر کسی اور سے نسبت رکھیں' اس سے چوری چھپے ملیں تو انہیں سزائیں دینے کے بعد کانونٹ سے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دروازہ کھولنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی... مگر دیکھنا چاہتی تھی کہ کون آیا ہے اور کیوں آیا ہے؟ یہ معلوم نہ کرتی تو تجسس کے مارے نیند نہ آتی۔ صبح تک جاگتی رہتی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر گہری تاریکی تھی۔ کسی کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے سانسوں بھری سرگوشی میں پوچھا۔ ''کون...؟''

فوراً ہی جواب نہ ملا۔ آنے والی ہستی پُراسرار بن رہی تھی۔ وہ اس کے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ اس نے کھڑکی کو بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک بھاری بھرکم مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ کسی نے اس کا نام لیا۔ ''یاقوت...!''

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ وہاں کوئی اسے یاقوت کے نام سے نہیں جانتا تھا اور باہر اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ مزید حیرانی اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ راہباؤں کی اس چار

دیواری میں کوئی مرد بول رہا تھا۔

وہ پھر بولا۔ ''ہائے... مغرور لیڈی ڈاکٹر...!''

یہ بات تو جیسے دھماکا تھی۔ وہ نام تو جانتا ہی تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آرمی اسپتال سے فرار ہونے والی لیڈی ڈاکٹر ہے اور یہ بھی جانتا ہوگا کہ اتحادی فوجی اس کے خون کے پیاسے ہیں۔

وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے سوچنے لگی کہ ایسے وقت کیا کرے؟

پھر ایک سرگوشی لہراتی ہوئی آئی۔ ''دروازہ کھولو۔''

اس نے کھڑکی کے باہر تاریکی میں گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''نہ تم نام سے جانو گی' نہ صورت سے پہچانو گی۔ دروازہ کھولو گی' دوستی ہوگی تو دوستانے سے پہچانو گی۔''

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

''میرا دھندا ایسا ہے۔ شکاری بو سونگھ کر اس کی پوری ہسٹری معلوم کر لیتا ہوں۔''

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ''شکاری کو اندر تو آنے دو۔''

''مجھے دروازہ کھول کر یہاں کے اصول نہیں توڑنے۔''

وہ بھاری بھرکم سرگوشی میں بولا۔ ''کھڑکی کھلتے ہی اصول ٹوٹ گئے۔ دروازہ نہیں کھولو گی تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاؤ گی۔ کل صبح تمہاری اصل ہسٹری مدر اور فادر کی میز پر ہوگی۔''

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ کچھ سوچا پھر پوچھا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''تمہارے پاس دینے کے لیے حسن کی دولت ہے۔ اس سے زیادہ نہیں چاہوں گا۔''

یاقوت نے کہا۔ ''اس کانونٹ میں چار مرد ہیں۔ ایک فادر ہیں' ایک کلرجی مین' ایک چرچ وارڈن اور ایک منتظم۔ تم ان میں سے کوئی ہو۔''

''اندازہ نہ کرو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے دیکھو اور خود کو دکھاؤ۔''

''پلیز! میں بے حیا بازاری نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو ایک نن کی خشک اور سپاٹ زندگی گزارنے یہاں نہ آتی۔ کسی امیر کبیر کی داشتہ بن کر اس کے حرم میں چھپ کر رہتی۔''

''اپنی پارسائی نہ جتاؤ۔ اگر یہ چاہتی ہو کہ تمہارا بھید نہ کھلے تو دروازہ کھول دو۔''

وہ دروازے سے ذرا دور ہو کر بولی۔ ''تم اچانک آ کر شاک پہنچا رہے ہو۔ میں اتنی جلدی تمہاری بات نہیں مانوں گی۔ مجھے سوچنا ہے... کیا یہاں زندگی گزارنے اور دشمنوں سے بچنے کے لیے عزت کو داؤ پر لگانا ہوگا؟''

''تمہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔''

''منوانا چاہتے ہو تو کل تک سوچنے اور تمہارے حق میں فیصلہ کرنے کی مہلت دو۔''

''تم مجھے کل تک ٹالنا چاہتی ہو؟''

''یہ خوب سمجھتے ہو کہ میں یہاں سے بھاگنے والی نہیں ہوں۔ تم سے پیچھا چھڑا کر باہر جا کر مرنا نہیں چاہوں گی۔''

وہ سوچنے کے انداز میں بولا۔ ''ہوں... اتنا تو یقین ہے' یہاں سے کہیں جا نہیں سکو گی۔ کل انکار نہیں کر سکو گی۔ ٹھیک ہے' میں بڑا صابر بندہ ہوں۔ کل آؤں گا۔''

یاقوت نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کو بند کر دیا۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھڑی رہ کر اس کی آہٹ سننا چاہتی تھی لیکن باہر خاموشی رہی۔ وہ کسی طرح کی آہٹ پیدا کیے بغیر گم ہو گیا تھا۔

وہ تخت کے سرے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس صاف ستھری پناہ گاہ میں ایک نیا شرمناک مسئلہ' ایک نیا شیطان پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کیا۔ زیرو پاور کی کمزور روشنی بجھ گئی۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

اندھیرا اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

داؤد محل کی فضا ماتمی تھی۔ کچھ رشتے دار آئے تھے۔ کچھ سرکاری افسران اور ماتحت ملازمین بھی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔ بیگم داؤد کی تدفین ہو چکی تھی۔ شام تک تقریباً سب ہی رخصت ہو گئے۔ دو چار رشتے داروں نے سارہ کی تنہائی دیکھ کر وہاں رہنا چاہا لیکن اس نے کہہ دیا۔ ''میں تنہا رہ کر صرف ماما کو یاد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہ کسی کے ساتھ وقت گزار سکوں گی' نہ باتیں کر سکوں گی۔''

داؤد بھی راتوں کو پی کر بدمست ہو جاتا تھا۔ اسے کسی کی موجودگی گوارا نہیں تھی۔ اس نے بھی ان رشتے داروں کو رخصت کر دیا۔ یوں سارہ کو تنہائی میں وسیم کی قربت ملی تو اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ نہ ہوتا تو باپ کے سینے سے لگ کر روتی لیکن ماں کی لاش کے پاس اس نے باپ کو نشے کی حالت میں دیکھا تھا۔ اسے صدمہ پہنچا تھا۔ ماں کی میت تدفین کے لیے تیار تھی' تب بھی اس نے باپ کو وہاں نہیں دیکھا۔ زیادہ پینے کے باعث طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔

سارہ کے لیے یہ اور بھی دُکھ کی بات تھی کہ باپ نے اس کی ماں کو آخری آرام گاہ تک نہیں پہنچایا تھا۔ ساری زندگی اپنی شریکِ حیات کو چھوڑ کر سرمستیاں کرتا رہا تھا۔ اسے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آخری وقت قبر میں پھنکوا دیا تھا' خود نہیں گیا تھا۔

وہ وسیم کی آغوش میں چھپ کر روتی رہی۔ ماں سے جتنی قربت رہی' اتنی باپ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ نصیب میں وسیم لکھا تھا۔ اس کی قربت مل رہی تھی۔ وہ آنسو پونچھ رہا تھا۔

دوسرے دن چچا کی فیملی لندن سے آئی۔ چچا اور چچی نے سارہ کو گلے لگا کر رسمی طور پر آنسو بہائے۔ اسے پیار کیا پھر ان کا جوان بیٹا جواد اسے گلے لگا کر رونے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔

وہ بولا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ اپنے باپ کے بازو سے لگ کر بولی۔ ''میں صرف بزرگوں سے ملتی ہوں۔ ہمارے درمیان ذرا فاصلہ رہنا چاہیے۔''

''تم لندن میں تو کھلے دل سے ملتی تھیں۔''

''تب ہم بچے تھے۔''

اس کی چچی نے کہا۔ ''ہم دقیانوسی خیالات رکھنے والے پس ماندہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ محرم سے لگنے اور نامحرم سے دور رہنے والی باتیں نہ کرو۔''

چچا نے کہا۔ ''پھر یہ کہ تم تو ہماری ہونے والی بہو ہو۔ بھائی جان نے اس رشتے کے لیے زبان دی ہے۔''

اس نے داؤد سے پوچھا۔ ''کیوں بھائی جان! اپنا وعدہ یاد ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں... مگر یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ تم تعزیت کے لیے آئے ہو۔''

اس نے بیٹی اور جواد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رشتہ ہوگا لیکن شادی سے پہلے میں ان کے درمیان بے تکلفی پسند نہیں کروں گا۔''

چچی نے خوش ہو کر کہا۔ ''آپ نے ہاں کہہ دی' ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکائیں گے۔''

وہ باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آ گئے۔ جواد اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تعزیت کے بہانے اسے پالینا چاہتا تھا لیکن حسرت ہی رہ گئی۔ اسے چھو بھی نہ سکا۔ اور سارہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اسے اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دے گی۔ اسے وسیم کی فکر تھی۔ وہ بھوکا ہوگا۔ انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''سوری! میرے کھانے کا وقت بدل گیا ہے۔ میں آدھی رات کے بعد کسی وقت اپنے روم میں ہی کھانا کھاتی ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔''

جواد نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ہم ایک دن کے لیے آئے ہیں۔ کل چلے جائیں گے۔ کچھ باتیں تو کرو۔''

داؤد نے کہا۔ ''سارہ! بیٹھ جاؤ۔ ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا ہے۔''

وہ بیٹھ گئی اور بولی۔ ''میں کل رات سے جاگ رہی ہوں۔ ایسا لگتا رہا جیسے ماما میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ آج بھی انہیں محسوس کروں گی' ان سے باتیں کروں گی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے جماہی لی۔ نیند کا بہانہ بھی کیا۔ چچی نے کہا۔ ''بیٹی! تم جاؤ۔ میں تمہارے جذبات سمجھ رہی ہوں۔ نیند آئے تو سو جانا۔ نہ آئے تو ماما سے باتیں کرتی رہنا۔ جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا تو میں بھی تنہائی میں ان سے بولتی رہتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ سُن رہی ہیں۔''

سارہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں آئی۔ پھر ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا لے کر دوسرے دروازے سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ دو افراد کا کھانا لے جاتے وقت کسی کی نظروں میں نہیں آئی۔

داؤد اپنے بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ جواد نے ماں سے کہا۔ ''مجھے ہونے والے سسر کے ساتھ پینا نہیں چاہیے۔ میں کہاں جاؤں؟''

''تمہارے لیے جو بیڈ روم ہے' وہاں بیٹھ کر شغل کرو۔ میں کمپنی دوں گی۔''

''اوہ ممی! سارہ سامنے ہوگی تو پینے کا مزہ آئے گا۔''

''اس کے مزاج کو سمجھو۔ وہ ماں کا صدمہ اٹھا رہی ہے۔ فی الحال اسے بھول جاؤ۔''

ماں بیٹے ایک بیڈ روم میں آ گئے۔ ماں نے وہسکی کے دو پیگ بنا کر ایک بیٹے کو پیش کیا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اسے دودھ پلاتی تھی۔ اب بھی کمپنی دینے کے لیے شراب پلایا کرتی تھی۔ ماں باپ اور بیٹا سب ہی مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

جواد نے پینے کے دوران کہا۔ ''آپ میری پسند کی ہر چیز بازار سے خرید کر لے آتی ہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا میں نے کوئی فرمائش کی ہو اور آپ نے پوری نہ کی ہو۔''

''تم میری جان ہو۔ جان بھی مانگو گے تو تم پر نچھاور

کروں گی۔"

"ابھی تو میں سارہ کو مانگتا ہوں۔"

ماں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔ "ابھی میں نے تم سے کیا کہا ہے؟ وہ ہماری طرح ابھی لائف انجوائے کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں، سمجھتا ہوں۔ ماں کا صدمہ اٹھا رہی ہے مگر مما! میرے اندر ایک کھلبلی سی ہے۔ اگر اسے چھو لیتا تو ایسی بے چینی نہ ہوتی۔"

وہ بیٹے کی ضرورت اور بے چینی کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اسے دماغ سے نکالو۔ یہاں اپنی ضد منواؤ گے تو جانتے ہو تمہارے انکل داؤد کیسے خوں خوار بھیڑیے ہیں۔ رشتے کا لحاظ نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ اُن سے ڈرتا بھی ہوں۔ انہیں ناراض کرنے والی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"بس اس سے دو باتیں کروں گا اسے چھو لوں گا تو تسلی ہو جائے گی۔"

"نہیں ہوگی۔ پہلے چھونے کو جی چاہتا ہے پھر پکڑنے کو... ایسے وقت خواہشیں چابک مارتی رہتی ہیں اور بندہ بے لگام ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ مجھ پر بھروسا کریں۔"

اس نے دوسرا پیگ حلق سے اتارا۔ ماں نے کہا۔

"بس اور نہ پیو۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں مما! بس وہاں جاؤں گا' اسے مناؤں گا کہ مجھ سے دو باتیں کرلے۔ پھر اسے راضی کروں گا تو وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گی۔"

اس نے تیسرا پیگ بنایا۔ وہ بولی۔ "میں منع کر رہی ہوں نا اور نہ پیو۔"

"او مما! پلیز... موڈ میں آنے دیں۔ ذرا سُر میں آنے سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اندر کی بات آسانی سے باہر آجاتی ہے۔"

وہ تیسرا پیگ پینے کے بعد اٹھ گیا۔ پھر تن کر بولا۔

"دیکھو مما! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈگمگا بھی نہیں رہا۔"

وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ماں کو دکھانے لگا کہ نشے میں نہیں ہے۔ یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا کہ نشے میں نہیں ہے تو سنبھل کر کیوں چل رہا ہے؟

خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ بیٹھ رہی تھی لیکن وسیم کے ساتھ جذباتی ازدواجی لمحات نہیں گزار رہی تھی۔ اس کی آغوش میں رو کر ماں کے بارے میں کبھی کبھی کچھ کہہ رہی تھی۔

وہ اس وقت کہہ رہی تھی۔ "میری مام جیسی کوئی نہیں ہوگی۔ انہوں نے میری خاطر سہاگن رہ کر بیوہ جیسی زندگی گزار دی۔ وہ مجھے کبھی بے سہارا چھوڑ نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے موت سے پہلے تمہیں میرا سہارا بنا دیا ہے۔"

وسیم نے اس کے کان میں کہا۔ "میں تمہاری مام کو سلام کرتا ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ ایک ویڈیو فلم چل رہی تھی۔ کمنٹری کرنے والے کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ ان دونوں کی آواز تقریباً معدوم ہوگئی تھی۔

وہ ذرا ڈگمگاتا ہوا' ذرا سنبھلتا ہوا دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہوگی یا ماں کے غم میں رو رہی ہوگی لیکن اندر سے ٹی وی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی بول رہا تھا۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔ اتنا تو معلوم ہو گیا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

وہ جاگ رہی ہے تو ٹی وی اسکرین پر کیا دیکھ رہی ہے؟ کیا سن رہی ہے؟ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ ٹی وی سے تو کوئی بول ہی رہا تھا مگر اس آواز کے پیچھے جیسی سی سارہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ کر چپ ہو گئی تھی۔ پھر ایک مختصر سی مردانہ آواز ابھر کر گم ہو گئی۔

جواد منہ کھول کر حیرانی سے سوچنے لگا۔ 'کیا وہ بول رہی ہے؟ ہاں۔ اس کی گنگناہٹ جیسی آواز سنائی دی تھی۔ پھر ایک اور آواز ابھری۔'

اس نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ 'وہ مردانہ آواز تو... ٹی وی سے آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا لگا تھا جیسے کوئی اور بھی بول رہا تھا مگر اب نہیں بول رہا ہے۔'

اس نے اپنے سر پر چپت مار کر سوچا۔ 'کیا میں نشے میں ہوں؟'

پھر سر ہلا کر دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ 'ہاں۔ مجھے چڑھ گئی ہے۔ مجھ پر تو سارہ کو چڑھنا تھا۔ یہ کم بخت شراب چڑھ رہی ہے۔ مجھے سنبھلنا چاہیے۔'

وہ پھر دروازے سے لگ گیا۔ کمنٹری کرنے والے کی آواز کے علاوہ بیک گراؤنڈ میوزک کا بھی شور تھا۔ ایسے شور میں سارہ کی گن گن کرتی ہوئی آواز ابھری۔ پتا نہیں' وہ کیا بول رہی تھی؟

اس نے سوچا۔ 'کیا اپنی ماں کی روح سے بول رہی ہے؟ اسے خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے؟ اگر دیکھ رہی ہے تو ٹی وی کون دیکھ رہا ہے؟ کیوں اسے خوامخواہ آن رکھا ہے؟'

پھر وہ چونک گیا۔ بیک گراؤنڈ میوزک کے شور میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔ صرف دو چار الفاظ کہے تھے پھر چپ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کمنٹری کرنے والے کی آواز ابھرنے لگی تھی۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر دروازے کو گھورنے لگا۔ نشے کی حالت میں گھور کر دیکھا جائے تو ایک کے دو دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دو دروازے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ 'لعنت ہے۔ کیا میں تین پیگ میں لڑھک گیا ہوں؟ ہرگز نہیں... میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔'

اس نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے سارہ! اِٹ اِز می... جواد۔"

وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ سارہ نے ریموٹ سے ٹی وی کو آف کرتے ہوئے پوچھا۔ "اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟ پلیز! مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

"ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔ کیوں کہہ رہی ہو کہ اتنی رات ہو گئی ہے؟ پھر یہ کہ تم جاگ رہی ہو۔ ٹی وی دیکھ رہی ہو۔"

وہ انکار نہیں کر سکتی تھی کہ ٹی وی سے دل بہلا رہی ہے۔ وہ بول رہا تھا۔ "ہم ایک رات کے مہمان ہیں۔ کل صبح کی فلائٹ سے چلے جائیں گے۔ پلیز! مجھ سے دو باتیں کرلو۔"

سارہ نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ باتھ روم میں چلا جائے۔ اس نے اشارے سے کہا۔ "میں بیڈ کے نیچے چھپ جاؤں گا۔"

وہ دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'میں اس سے دو باتیں کروں گی۔ ٹال دوں گی۔ بے چارہ وسیم بار بار اسٹور روم میں جا کر بند ہوتا ہے۔ بیزار ہو گیا ہے۔'

اس نے اشارے سے کہا۔ "ٹھیک ہے' بیڈ کے نیچے چلے جاؤ۔"

وہ فوراً ہی قالین پر لیٹ کر کروٹ بدلتا ہوا بیڈ کے نیچے جا کر گم ہو گیا۔ سارہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی توازن قائم نہ رکھ سکا' سنبھلتے سنبھلتے اوندھے منہ گر پڑا۔ گرتے ہی سر فرش سے ٹکرایا تو جیسے چکرا کر رہ گیا۔

اس کا رخ بیڈ کے نچلے حصے کی طرف تھا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں کسی مرد کا سایہ سا دکھائی دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے' دماغ کو قابو میں رکھنے کے لیے آنکھیں بند کیں۔

سارہ نے پوچھا۔ "کیا تم نے بہت پی لی ہے؟"

"نن... نہیں۔ میں نشے میں نہیں ہوں' بالکل ہوش میں ہوں۔"

اس نے آنکھیں کھولیں' بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب سر چکرایا تھا' آنکھوں کے سامنے لمحاتی تاریکی چھا گئی تھی' تب اسے بیڈ کے نیچے کسی کا سایہ دکھائی دیا تھا۔ اب کچھ نہیں تھا۔ دماغ صاف ہو گیا تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ 'اب میں پورے ہوش میں ہوں۔ یہاں کی ہر چیز کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کسی کا سایہ وایہ نہیں ہے۔'

سارہ نے پوچھا۔ "کیا صبح تک یہیں پڑے رہو گے یا اٹھنے کی زحمت بھی کرو گے؟"

وہ دونوں ہاتھ ٹکا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں خوش خبری سنانے آیا تھا۔ اگرچہ ابھی یہ خوش خبری نہیں سنانا چاہیے۔ تمہاری مام کے لیے جتنا بھی صدمہ ہو' جتنے بھی آنسو بہائے جائیں' کم ہیں۔ میرا دل تمہاری مام کے لیے رو رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں' تم اندر سے کس قدر روتے ہوئے کوئی خوش خبری سنانے آئے ہو۔ چلو... جلدی سے سنا دو۔ پھر مجھے سونا ہے۔"

وہ بولا۔ "ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں بڑی ہی رومانٹک بات کہنے والا ہوں۔"

"تم میرے چچا زاد بھائی ہو۔ چھوٹی بہن سمجھ کر ہاتھ پکڑ سکتے ہو۔"

"شادی سے پہلے چچا زاد' پھوپھی زاد' ماموں زاد بھائی بہن ہی ہوتے ہیں۔ مام کے چالیسویں کے بعد ہمارا رشتہ بدل جائے گا۔"

وہ انجان بن کر خوش ہو کر بولی۔ "رشتہ بدل جائے گا؟ کیا ہم سگے بھائی بہن بن جائیں گے؟"

"او نو سارہ! ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔"

”اونو جواد! میری شادی اب کسی سے نہیں ہو سکتی۔ میں سہاگن ہوں۔“

وہ تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”جو تم سن رہے ہو۔ ایک جن مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔ تنہائی میں آ کر مجھے چھیڑتا تھا۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔“

”یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ انکل تو مجھے داماد بنانے والے ہیں۔“

”ابھی انہیں معلوم نہیں ہے۔ میں نے بتایا نہیں ہے۔ وہ یقین نہیں کریں گے کہ ایک جن اُن کا داماد بن چکا ہے۔“

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے وہ جن؟ میں اسے دیکھوں گا۔“

”یہیں... تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔“

اس نے مارے خوف کے اچھل کر پیچھے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ جھینپ کر بولا۔ ”کیوں مذاق کر رہی ہو...؟“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اب یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مگر جنات کسی کو نظر نہیں آتے اس لیے تم اسے دیکھ نہیں پا رہے ہو۔“

”پھر تم کیسے دیکھ رہی ہو؟“

”میں شریکِ حیات ہوں۔ یہ میرا مجازی خدا ہے۔ صرف میں ہی اسے دیکھ سکتی ہوں۔“

وہ چاروں طرف گھوم کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں مانتا۔ پلیز! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔“

”میرا خاوند صرف بھائی کو میرا ہاتھ پکڑنے دے گا۔“

وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ”میں نہیں مانتا کہ یہاں کوئی ہے۔ بس ایک بار اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں تمہیں پا لینا چاہتا ہوں۔“

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”قریب نہ آؤ۔ فاصلہ رکھو۔“

”اب میں دور نہیں رہوں گا۔ تمہارے اندر اگر جن گھسا ہوا ہے تو اسے مار بھگاؤں گا۔ میری آغوش میں آؤ۔ میں اپنے رقیب سے نمٹ لوں گا۔“

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ اس سے کتراتے ہوئے بولی۔ ”ہوش میں آؤ اور یہاں سے جاؤ۔ ورنہ میں پاپا کو آواز دوں گی۔“

”وہ تو پی کر ٹن ہو گئے ہوں گے۔ تمہاری آواز نہیں سنیں گے۔ جوانی کی صدائیں مجھے سناؤ۔“

وہ جھپٹنے کے انداز میں آگے بڑھا لیکن اسے چھو نہ سکا۔ اوندھے منہ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ سارہ نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ ”آخری بار سمجھاتی ہوں۔ یہاں سے نہیں جاؤ گے تو...“

وہ بات پوری نہ کر سکی۔ جواد نے اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ وہ نشے کے باعث توازن قائم نہ رکھ۔ سارہ کو جکڑتے ہوئے فرش پر گر پڑا۔ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ جھنجلا گئی تھی۔ اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے اسے ایک لات ماری۔ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی، اس سے پہلے ہی وہ اس پر آ گرا۔

وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا مگر اسے پکڑنے اور جکڑنے کے بعد ہوس بڑھ گئی تھی۔ بدن کی زرخیزی پاگل کر رہی تھی۔ وہ فرش پر پڑی تھی۔ اس کا بوجھ اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت جواد کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

وسیم برداشت نہ کر سکا۔ وہ رقیب اس کی سارہ کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اس نے پیتل کا گل دان اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا... کوئی مرد یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی عورت کو لوٹ کا مال سمجھا جائے۔ وہ بھی غصے اور جھنجلاہٹ میں بھول گیا کہ خود کو ظاہر کر رہا ہے۔ سارہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ اگرچہ اس کی مردانگی اچھی لگی لیکن یہ مردانگی اب مہنگی پڑنے والی تھی۔

سر پر زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ جواد کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ اسے اچھی طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اس نے سر گھما کر حملہ کرنے والے کو دیکھنا چاہا۔ دائیں بائیں اور پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وسیم چھپنے کے لیے جا چکا تھا۔

سارہ نے فوراً ہی فرش پر پڑے ہوئے گل دان کو اٹھا لیا۔ جواد کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ اپنی گردن پر لہو کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلکنے سے پہلے دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر اسی طرح بیٹھا رہ گیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سارہ اس گل دان کو ہاتھ میں اٹھا کر کہہ رہی تھی۔ ”اگر تم یہاں سے نہ گئے تو اس بار سر توڑ دوں گی۔“

جواد نے جھومتے ہوئے اسے دیکھا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں کچھ اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا لیکن گل دان آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سارہ آگے ہے تو چوٹ سر کے پیچھے کیسے لگی؟

تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اپنے پیروں پر

کھڑے رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس کی ماں بیٹے کے لیے پریشان تھی۔ دل میں یہ بات تھی کہ وہ نشے کی حالت میں کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھے۔

وہ خیریت معلوم کرنے کے لیے اُدھر آئی۔ اسی وقت سارہ نے دروازہ کھولا تاکہ جواد رینگتا ہوا وہاں سے چلا جائے۔ ماں نے بیٹے کے خون آلود سر کو دیکھا پھر اسے رینگتے ہوئے دیکھا تو چھاتی پیٹتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔

”کیا ہو گیا میرے بچے کو...؟ ہائے اللہ! میں مر جاؤں گی۔“

اس نے سارہ کے ہاتھ میں پیتل کا گل دان دیکھا۔ وہ بولی۔ ”آپ کا بیٹا میری عزت پر حملہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے سزا دی ہے۔ باقی سزا پاپا دیں گے۔“

جواد نے ماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ممتا نے تڑپ کر کہا۔ ”میرے بیٹے نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں دیکھتی آ رہی ہوں' تم اس سے کترا رہی ہو... یہ تو یہاں دو باتیں کرنے آیا تھا اور تم نے اس کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا ہے۔“

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں دونوں بھائی پی رہے تھے۔ اس نے پیتل کا گل دان انھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”انکل! میں نے اس گل دان سے جواد کا سر توڑ دیا ہے۔ وہ نشے میں میری عزت پر حملہ کرنے آیا تھا۔“

دونوں بھائی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ داؤد نے پوچھا۔ ”کیا جواد نے ایسی گری ہوئی حرکت کی ہے؟“

”جی ہاں۔ آپ خود چل کر میرے کمرے کے سامنے دیکھ لیں۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ادھر آئے۔ ماں بیٹے کو سہارا دے کر اپنے کمرے کی طرف لے جا رہی تھی۔ پھر باپ نے بھی اسے سہارا دیا۔ داؤد نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر جواد کو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا۔ پھر بھائی سے کہا۔ ”شکر کرو' یہ تمہارا بیٹا اور افسوس کہ میرا بھتیجا ہے۔ ورنہ ابھی اسے گولی مار دیتا۔“

وہ بولا۔ ”بھائی جان! یہ نادان ہے۔ ہمارا ہی خون ہے۔ آپ غصہ تھوک دیں۔ ہم بزرگ ہیں۔ اسے سزا دیں گے' یہ آپ کے قدموں میں سر رکھے گا۔ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے' سر نہیں اٹھائے گا۔“

داؤد نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ پھر ایک گارڈ سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فرسٹ ایڈ بکس لے آؤ۔“

محل کے اندر صرف خسرے گارڈ ہی آتے تھے۔ ایک خسرہ ابتدائی طبی امداد کا سامان لے آیا۔ جواد بیڈ پر اوندھا پڑا تھا.... اس نے سر سے لہو پونچھا۔ مرہم پٹی کی پھر وہاں سے چلا گیا۔

سارہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد باتھ روم میں آ کر اسٹور روم کے دروازے پر دستک دی۔ ”میں ہوں سارہ...“

وسیم دروازہ کھول کر باہر آیا تو وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ”تم نے اچھا کیا مگر غلطی بھی کی۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتا تو پھر بچنے کا موقع نہیں دیتا۔“

”مجھے اور موقع نہیں ملا۔ ورنہ اسے جان سے مار ڈالتا۔ وہ میری جان کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔“

وہ خوش ہو کر اس پر قربان ہونے لگی۔ اسے بتانے لگی کہ اپنے پاپا اور جواد کے ماں باپ کے سامنے کیسی باتیں بنائی ہیں... خطرہ ٹل گیا ہے۔ کوئی اس کی موجودگی پر شبہ نہیں کرے گا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہم بیڈ روم میں چلیں؟“

”ہاں چلو... مگر میں پہلے دیکھ کر آتی ہوں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔“

وہ پھر چھپنے کے لیے چلا گیا۔ سارہ بیڈ روم سے باہر آ کر دبے قدموں جواد کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

وہ اپنے بیڈ پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ زود اثر دواؤں کے باعث تکلیف کچھ کم ہوئی تھی۔ اب وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ سوچ رہا تھا' اس کے ساتھ کچھ عجیب سے حالات پیش آئے ہیں۔

اسے ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ جب وہ سارہ کو دبوچتے ہوئے زمین پر گرا تھا' تب وہ سامنے تھی۔ پھر سر کے پچھلے حصے پر کس نے ضرب لگائی؟

وہ خالی ہاتھ تھی۔ ایسے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ جب تاریکی چھٹ گئی اور وہ نظر آنے لگی تو اس کے ہاتھوں میں گل دان دکھائی دیا تھا۔

اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ سامنے سے حملہ کرے اور سر کے پیچھے چوٹ آئے.... جبکہ سر کے اگلے حصے کو گل دان کی زد میں آنا چاہیے تھا؟

یہ ایسی باتیں تھیں جو اسے الجھا رہی تھیں۔ پھر یاد آیا کہ کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ کنسٹری کرنے والا بول رہا تھا۔ اس کے ساتھ سارہ کی دھیمی سی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ آخر وہ کس سے بول رہی تھی؟

یہ بھی یاد آیا کہ کنسٹری کرنے والے کے علاوہ ایک اور مردانہ سرگوشی بھی ابھری تھی۔ کیا وہ سارہ سے بول رہا تھا؟ سارہ اس سے بول رہی تھی؟

وہ سوچ رہا تھا۔ داؤد اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ وہاں بیٹھا اسے باتیں سنا رہا تھا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ ”ذلیل...! کمینے! تو میرے بھائی کا بیٹا ہے، ہمارا خون ہے اور ہمارے ہی گھر میں ڈاکا ڈالنے گیا تھا؟“

ایسے ہی وقت معمول کے مطابق بجلی چلی گئی۔ چارجر لائٹ آن ہو گئی۔ باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”بھائی جان تمہیں داماد بنانے والے ہیں اور تم نے ہمارا سر جھکا دیا۔“

”میں اسے داماد بناؤں گا۔ اسے بہت چاہتا ہوں مگر پہلے اس کی پٹائی کروں گا۔ ذرا یہ اچھا تو ہو جائے۔“

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ”بھائی جان! یہ آپ کا بیٹا ہے۔ ہماری طرف سے بھی اس کی پٹائی کریں۔“

ایسے ہی وقت جواد اُچھل کر بیٹھ گیا۔ سب ہی اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اسے یاد آیا تھا کہ جب اوندھے منہ فرش پر گرا تھا تو بیڈ کے نیچے ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔

یہ یاد آتے ہی کڑی سے کڑی مل گئی کہ اسی سائے نے پیچھے سے سر پر ضرب لگائی ہوگی اور اسی کی آواز کنسٹری کرنے والے کے ساتھ اور بیک گراؤنڈ میوزک کے شور میں دبی دبی سی سنائی دی تھی۔

باپ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ تم تکلیف سے بے حال تھے' ایک دم سے اچھل کر کیسے بیٹھ گئے؟“

وہ داؤد کو دیکھ کر بولا۔ ”انکل! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور پورے یقین سے کہتا ہوں' سارہ نے میرے سر پر گل دان نہیں مارا تھا۔ کسی نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ سارہ کے کمرے میں کون پیچھے سے حملہ کرے گا؟“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں' کوئی بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کے بعد دیکھ نہ سکا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ پلیز! مجھ پر بھروسا کریں۔ ایک بار میری باتیں توجہ سے سن لیں۔“

وہ پوری تفصیل کے ساتھ بولنے لگا۔ وہ تینوں توجہ سے سن رہے تھے اور اس سے سوالات کر رہے تھے۔

”کیا ٹی وی اونچی آواز میں آن تھا اور اس دوران سارہ بول رہی تھی؟“

”کیا تمہیں پورا یقین ہے' تم نے کنسٹری کرنے کے علاوہ ایک اور مردانہ آواز سنی تھی؟“

”کیا فرش پر گرنے کے بعد واقعی تم نے کسی شخص کی جھلک دیکھی تھی؟“

”کیا سارہ تمہارے آگے تھی اور حملہ پیچھے سے کیا گیا تھا؟“

”ہاں...“ ہر سوال کے جواب میں وہ پورے یقین سے ہاں کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے کہا۔ ”بھائی جان! یہ میرا ہی نہیں، آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اس کی بات کا یقین کریں۔ وہاں چل کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟“

پچھلی رات اس پورے محل میں دوسری بار وسیم کو تلاش کیا گیا تھا اور وہ نظر نہیں آیا تھا۔ داؤد پھر بیٹی کے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات ایک بار پھر نشتر کی طرح چبھنے لگی کہ اس نے بیٹی کے فون سے دشمن چھوکرے کی آواز سنی تھی۔

اب یہ سوچ رہا تھا کہ بیٹی جھوٹ بول سکتی ہے۔ اس کے فون کی سم چرائی نہیں گئی ہے۔ چور کہلانے والے کو اس نے کہیں چھپا دیا ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب ہی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ یہ بہت چونکا دینے والا انکشاف ہو سکتا تھا۔ وہ وہاں سے سارہ کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ ماں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ بیٹے کا بیان سچ ثابت ہو جائے۔ اس کے بیٹے کا سر پھاڑ دیا گیا تھا۔ وہ سارہ کو بددعائیں دے رہی تھی۔

وہ چاروں دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اندر سے بند ہوگا لیکن وہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر سے چارجر لائٹ کی روشنی باہر آ رہی تھی۔

داؤد غصے میں تھا کہ اس بار وسیم کو ضرور پکڑ لے گا۔ وہ اسی کمرے میں ہوگا لیکن کھلا ہوا دروازہ کہہ رہا تھا' چور وہاں چھپ نہیں سکتا۔ وہ دروازہ کھلے دل اور کھلی نیت کی طرح تھا۔

داؤد نے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ بیٹی مصلے پر بیٹھی زیرِ لب تسبیح پڑھ رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جواد نے کمرے میں آتے ہی بیڈ کے نیچے جھک کر دیکھا۔ ماں نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ پھر اُدھر جانے لگی۔ جواد کا باپ اسٹور روم کا دروازہ کھول کر دیکھنے لگا۔

ان سب کے ہاتھوں میں چھوٹے سائز کی چارجر لائٹس تھیں۔ سارہ نے پوچھا۔ ”پاپا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے دو بار تمام گارڈز نے آ کر تلاشی لی۔ اب آپ... بھائی اور بھتیجے کے ذریعے تلاشی لے کر میری توہین کر رہے ہیں۔ کیا میں بدچلن ہوں؟“

داؤد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”خاموش رہو۔ جواد نے یہاں کسی کو دیکھا ہے۔ میرے اندر بھی پھانس اٹکی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے ہم نہ چراتی ہو اور تم نے اسے چھپا کر رکھا ہو۔“

وہ بولی۔ ”واہ پاپا! آپ نے کھل کر کہہ دیا کہ بیٹی بے حیا ہے... بدچلن ہے۔“

”اگر یہ غلط ہوا تو باپ تم سے معافی مانگ لے گا۔“

بھائی نے اسٹور روم سے باہر آکر کہا۔ ”بھائی جان! یہاں کافی وزنی سامان رکھا ہوا ہے۔ کیا اس کے پیچھے دیکھا گیا ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”ایک اکیلا شخص وہ وزنی سامان ہٹا کر چھپنے کے لیے پیچھے نہیں جاسکتا۔“

بھاوج نے آکر کہا۔ ”باتھ روم میں ایک دروازہ ہے جو اِدھر کھلتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اُدھر سے سامان کے پیچھے جاکر اندر سے دروازہ بند کرلیتا ہو۔“

داؤد اسٹور روم میں آکر اوپر سے نیچے تک سامان کو دیکھنے لگا۔ اس دروازے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ہمیشہ سے ہی اندر سے بند رہتا ہے اور واقعی وہ باتھ روم کی طرف سے نہیں کھلتا تھا۔

یہ ایک بات ذہن میں نہیں آئی کہ بیگم اور بیٹی نے غلط بیانی کی ہوگی۔ وہ پورے محل کے دروازے کھڑکیوں کا حساب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ماں بیٹی کی بات مان لی تھی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکا باتھ روم سے اسٹور روم میں جاکر دروازے کو اندر سے بند کرلیتا ہوگا۔

اس نے بھائی سے کہا۔ ”میں گارڈز کو بلا کر یہ سامان نہیں ہٹاؤں گا۔ اگر واقعی وہ اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے تو میں شرم سے مرجاؤں گا۔“

بھائی نے کہا۔ ”آپ باہر سے کسی کو نہ بلائیں۔ میں جواد کے ساتھ یہ سامان ہٹا سکتا ہوں۔“

وہ باپ بیٹا مزدور بن گئے۔ بڑی محنت سے سامان ہٹانے لگے۔ داؤد بھی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔

سارہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔ ”پاپا! یہاں کوئی نہیں ہے۔ سامان نہ ہٹائیں۔ میں شرم سے مری جارہی ہوں۔“

اس کے آنسو سمجھا رہے تھے کہ دال میں کالا ہے اور وہ کالا سامنے آنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی وہ شرم سے مری جارہی ہے۔

تین بچے کھٹے مرد لگے ہوئے تھے۔ پہاڑ کو سرکا رہے تھے۔ آخر وہ سرک ہی گیا۔ جیسے میدان صاف ہوگیا۔ کھلے میدان میں کوئی چھپ نہیں سکتا اور کوئی وہاں چھپا ہوا نہیں تھا۔ عورت کے متعلق کہا جاتا ہے وہ یار کو چھپانا چاہے تو آنکھ کے کاجل میں چھپا لیتی ہے۔ مرد کی ساری ذہانت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

باتھ روم کی طرف سے کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی نچلی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ چھپا ہوتا اور وہاں سے نکل کر جاتا تو اندر سے کنڈی لگی نہ رہتی۔ دروازہ باتھ روم کی طرف کھلا ہوتا... لیکن وہ تو بند تھا۔ ثابت ہوگیا کہ بیٹی کے کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔

حقیقتاً وہ نچلی کنڈی ایسی تھی کہ باہر آکر دروازے کو زور سے بند کرو تو وہ جھٹکا کھا کر نیچے آکر اٹک جاتی تھی۔ یوں وہ باہر سے بند ہوجاتا تھا اور وسیم نے وہاں سے جاتے ہوئے اسی تدبیر سے اسے بند کیا تھا۔

سارہ اسے چارجر لائٹ کی روشنی میں دبے قدموں چلتے ہوئے ماں کے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ وہاں وہ اسٹور روم میں رکھی ہوئی الماری کے پیچھے چھپ سکتا تھا۔ اس نے ماں کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد حالات معمول پر آتے تو وہ وسیم کو اپنے کمرے میں لے آتی۔

تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ جواد کے منہ پر تھپڑ پڑا۔ داؤد اس کی پٹائی کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے میری معصوم بچی کی انسلٹ کی ہے۔ میں اسے یہاں رہنے نہیں دوں گا۔“

اس نے بھائی اور بھاوج سے کہا۔ ”تم سب یہاں سے نکلو۔ انیکسی میں صبح تک رہو۔ پھر مجھے صورت دکھائے بغیر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“

وہ تینوں سر جھکا کر وہاں سے جانے لگے۔ داؤد نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں نے بھی تم پر شبہ کیا۔ میں باپ ہوں۔ سونے کا نوالہ کھلاتا ہوں شیر کی نظر سے دیکھتا ہوں... پھر بھی سوری کہتا ہوں۔“

وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی پھر دوڑتی ہوئی مصلے پر آئی اور سجدے میں گر پڑی۔ حالات ایسے سازگار ہوئے تھے کہ آئندہ اس کا باپ بھی اس کے کمرے میں آنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر وہی منظر تھا۔

رات جانے والی تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ ایسے وقت ایک پولیس وین اس وسیع و عریض عمارت کے سامنے آکر رک گئی۔ امریکی اس عمارت کو ڈیتھ ہاؤس کہتے تھے اور عراقی اپنی زبان میں اسے دارالاجل بولتے تھے۔ سانسیں لیتی ہوئی زندگیاں وہاں پہنچ کر ختم ہوجاتی تھیں۔

اس پولیس وین کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ قاضی ابرار ہاشمی باہر آیا۔ وہ جیل خانے کی مسجد کا پیش امام تھا۔ اکثر دارالاجل میں آکر سزائے موت پانے والے قیدیوں کو آخری نماز پڑھاتا تھا۔ انہیں کلام پاک کی آیات سناتا تھا۔ پھر سپاہی ان قیدیوں کو پھانسی کے تختے پر یا گیس چیمبر میں لے جاتے تھے۔

اذان ہورہی تھی۔ ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ قاضی ابرار ہاشمی نے نئے پولیس افسر کو دیکھا۔ وہ نئے اسٹاف کے ساتھ آیا تھا۔ پرانے افسر اور اس کے ماتحت سپاہیوں کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ وہ نئے افسر کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

وہاں ایک کمرے میں معمول کے مطابق قاضی صاحب کے شناختی کاغذات چیک کیے گئے پھر انہیں آگے جانے کی اجازت دی گئی۔ ان کے آگے پیچھے چلنے والے جیلر اور سپاہیوں نے آگے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا۔ وہ اس دروازے سے گزر کر آگے بڑھے تو پچھلا دروازہ بند ہوگیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دوسرا دروازہ کھل گیا۔

وہ دوسرے دروازے سے گزر کر ایسی راہداری میں آئے جس کے اطراف تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ ہر کوٹھری میں ایک قیدی تھا۔ وہ سب ہی اپنی موت کی مقررہ تاریخ تک جی رہے تھے۔

قاضی ابرار ہاشمی پولیس افسر اور سپاہیوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک کوٹھری کے سامنے آکر رک گیا۔ صبح کی اذان ہوچکی تھی۔ ایک قیدی حارث الجمالی نیچی چھت والی تنگ کوٹھری میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ایسے وقت قاضی ابرار ہاشمی نے سلاخوں کے باہر نماز ادا کی۔ پولیس افسر اور سپاہی چپ چاپ ایک دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

نماز کے بعد اسسٹنٹ جیلر نے آکر آہنی سلاخوں والے دروازے کو کھولا۔ قاضی نے اندر آکر کہا۔ ”السلام علیکم...“

حارث نے جواب نہیں دیا۔ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ قاضی نے پولیس افسر اور جیلر سے کہا۔ ”اسے نشانے پر رکھو۔ یہ خطرناک ہے۔“

انہوں نے حارث کی طرف گنیں سیدھی کیں۔ قاضی ابرار ہاشمی نے مطمئن ہوکر دونوں ہاتھ باندھے۔ پھر کلام پاک کی آیت پڑھنے کے لیے منہ کھولا۔ ایسے ہی وقت پولیس افسر نے اپنے ریوالور کی نال اس کے منہ میں ٹھونس دی۔

یہ بالکل ہی خلافِ توقع تھا۔ اس کے دیدے خوف اور حیرانی سے پھیل گئے۔ منہ کھلا ہوا تھا مگر وہ کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔

حارث نے کہا۔ ”تم مسلمان ہو مگر منافق ہو۔ دکھاوے کے لیے نمازیں پڑھتے اور پڑھاتے ہو... لیکن امریکی اتحادیوں کے آگے جھکتے ہو۔ تمہارے بچے کینیڈا میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ موت کی سزا مجھے نہیں تمہیں ملنی چاہیے۔“

پھر اس نے پولیس افسر سے کہا۔ ”قصہ ختم کرو۔“

اس نے کہا۔ ”ذرا انتظار کرو۔ سگنل ملنے والا ہے۔“

جیلر نے کہا۔ ”میں جاکر دیکھتا ہوں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ ایسے وقت تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت سگنل مل گیا۔ اس عمارت کے صدر دروازے پر زبردست بم دھماکا ہوا۔ وہاں کے در و دیوار لرزنے لگے۔ پولیس افسر نے قاضی صاحب کو گولی ماردی۔

جیلر نے کہا۔ ”نکلو یہاں سے... مجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔ جتنی جلدی ہوسکے نکل جاؤ، گورے آقاؤں کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے اپنی کارکردگی دکھانی ہے۔“

وہ سب وہاں سے دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ دور و نزدیک مسلسل فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جیلر ان سے الگ ہوکر دوسری سمت چلا گیا تھا۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس عمارت کے صدر دروازے کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ مجاہدین اندر گھس آئے تھے۔ اِن کاؤنٹر فائرنگ ہورہی تھی۔ وہ حارث جیسے فولادی مجاہد کو وہاں سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا رہے تھے۔

حارث کو ایک گن دی گئی تھی۔ وہ بڑی مہارت سے چھپتا چھپاتا، چھلانگیں لگاتا اور کبھی فرش پر لڑھکتا ہوا فائر کرتا ہوا سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارتا جارہا تھا۔

صدر دروازے کی دیواریں دور تک منہدم ہوگئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر اس کے لیے وین کھڑی تھی۔ مجاہدین اسے سگنل دے رہے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا آکر وین میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ آگے بڑھ کر تیز رفتاری سے ایک سمت بڑھنے لگی۔

اس زبردست دھماکے کے باعث جیل کا ایک حصہ کھنڈر بن گیا تھا۔ آہنی دروازے اور دیواریں گر گئی تھیں۔ دوسرے کئی قیدی بھی فرار ہوگئے تھے۔ آئندہ ان کی سزائے

موت پر عمل ہونے والا تھا۔ اب انہیں نئی زندگی مل رہی تھی۔

نارتھ سینٹرل جیل میں امریکی اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا۔ وہاں ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ایسی جگہ مجاہدین بڑی بے باکی سے ڈیتھ ہاؤس کی اہم عمارت کو کھنڈر بنا کر حارث الجماکلی کو نکال لے گئے تھے۔

اس علاقے کی پولیس اور فوج کو ہائی الرٹ کر دیا گیا۔ تمام راستوں کی ناکا بندی ہونے لگی۔ ایک انتہائی سفاک درندے ایس پی جبار القائدی کو فوراً ہی فون پر حکم دیا گیا اور کہا گیا۔ ''جس حال میں بھی ہو، اسی حلیے اور لباس میں دوڑو۔ حارث الجماکلی سلیمانیہ کی حدود میں ہوگا۔ اسے دور جانے سے پہلے ہی دبوچ لو۔ وہ زندہ ہاتھ نہ آئے تو مردہ بنا کر ہمارے سامنے لاؤ۔''

جبار القائدی اسم با مسمیٰ تھا۔ جبر کی انتہا کر دیتا تھا۔ جو مجاہدین اس کی گرفت میں آجاتے، انہیں بڑی سخت اذیتیں دے کر مار ڈالتا تھا۔ چند ماہ پہلے حارث الجماکلی سے مقابلہ ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پسینا چھوٹ گیا تھا۔

حارث اتحادیوں کے ایک فوجی قافلے پر کامیاب حملہ کرنے کے بعد فرار ہو رہا تھا۔ جبار نے اپنے فائٹروں کے ساتھ اسے گھیر لیا تھا۔ اس ان کاؤنٹر میں مجاہدین بھی تھے۔ کئی گھنٹوں تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا۔ دونوں طرف کے لوگ مرتے رہے۔

مجاہدین کے طریقہ کار کے مطابق ہر حملے کے بعد فرار ہونا لازمی تھا۔ وہ موقع پا کر ایک ایک کر کے اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگنے لگے۔ حارث تنہا رہ گیا۔

جبار سے ٹھن گئی تھی۔ اس کے سپاہی بھی مارے گئے تھے۔ وہ خود زخمی ہوا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ حارث بھی زخمی ہے۔ یہ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ وہ اسے گولیوں سے چھلنی کر کے جانا چاہتا تھا۔

ان کے درمیان فیصلہ کن فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ دو میں سے کسی ایک کو مرنا تھا۔ میدان جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی ایک موت کے گھاٹ اترتا ہے، دوسرا فاتح بن کر جاتا ہے۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ دونوں کی ایک ایک گولی نے دونوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ جبار کو پہلی گولی جس ٹانگ میں لگی تھی، دوسری گولی بھی وہیں آکر پیوست ہوئی تھی۔ دونوں گولیاں اس کے اندر انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ گرنے کے بعد اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

حارث کا پہلا زخم معمولی تھا۔ دوسری گولی بازو میں آکر پیوست ہوئی تھی۔ وہ گن چلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زخمی سپاہیوں نے آکر اسے گرفتار کر لیا تھا۔ پولیس اسپتال میں اس کے بازو سے گولی نکالی گئی۔ اس کا علاج کرایا گیا۔ پھر اسے ابوغریب جیل ..... بھیج دیا گیا۔

جبار نے لنگڑاتے ہوئے جیل میں آکر حارث کو نفرت اور غصے سے دیکھا پھر گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''تو نے مجھے ایک پیر سے اپاہج بنا دیا ہے۔ اگر تو اتحادی فوجیوں کو مطلوب نہ ہوتا تو اس جیل میں تجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالتا۔''

حارث نے کہا۔ ''اگر میں سلاخوں کے پیچھے نہ ہوتا تو تجھے ایک ایک گالی کے جواب میں سو سو زخم لگاتا۔ زندہ رکھ کر مارتا رہتا۔ کوئی بات نہیں۔ کبھی یہاں سے نکلوں گا تو تجھ سے نمٹ لوں گا۔''

وہ اس کی طرف تھوکتے ہوئے حقارت سے بولا۔

''تیرا باپ بھی اور تیرے مجاہدین بھی تجھے ... یہاں سے نہیں نکال سکیں گے۔ اتحادی تجھے سزائے موت دیں گے۔''

اور یہی ہوا۔ اسے سزائے موت دینے کے لیے سلیمانیہ کے ڈیتھ ہاؤس میں پہنچایا گیا تھا جہاں سے اب وہ فرار ہو چکا تھا۔ اس نے جبار کو چیلنج کیا تھا کہ کبھی جیل سے نکلے گا تو ایک ایک گالی کے جواب میں سو سو زخم لگائے گا۔

اور جبار یہ قسم کھا چکا تھا کہ اسے فرار ہونے کے بعد کہیں چھپنے نہیں دے گا۔ دوڑا دوڑا کر کتے کی موت مارے گا۔

داؤد اسرار اور جبار القائدی جیسے وطن فروشوں کے کاندھوں پر اتحادی فوج کی بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے ذریعے مجاہدین کو کچل ڈالنا چاہتے تھے۔

یہ سامراجی قوتیں بھول رہی تھیں کہ عراق کی زمین پر صدیوں سے ایسے معرکے برپا ہوتے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں سے لے کر کربلا تک کی تاریخ سے انہیں بہت کچھ سیکھنا چاہیے تھا کہ ظالم اور جابر کو کبھی عزت اور فتح نصیب نہیں ہوتی۔

چار ہزار سال پہلے اسی ملک عراق میں نمرود نے آگ بھڑکائی تھی اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اسے گلزار بنا دیا تھا۔

تین سو تیرہ صحابہ کرامؓ نے حضرت محمدؐ کی قیادت میں یہی سبق کفار کو سکھایا تھا۔ آج بھی سامراجی اور جارح قوتوں کو یہ سبق مل رہا تھا۔ عراق پر حملہ کرنے کے بعد پانچ برسوں میں امریکا تین کھرب ڈالرز اور برطانیہ دس ارب پاؤنڈز جنگ میں جھونک چکے ہیں۔ ہزاروں امریکی اور برطانوی فوجی ہلاک اور اپاہج ہو چکے ہیں۔

امریکی تھنک ٹینک کا بیان ہے کہ عراق کی جنگ ویت

نام کی جنگ سے تین گنا زیادہ بھاری پڑ رہی ہے۔

ایسی ضدی جارحیت کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ عراق سے واپس جانے والے فوجی مسلسل تھکن اور جی متلانے کی شکایت میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیار استعمال کرنے ..... کے باعث جینیٹک وائرس ان فوجیوں کی بیویوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ہونے والے بچوں میں پیدائشی نقائص لازمی ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں نسوانی پیچیدہ امراض میں مبتلا رہتی ہیں۔ امریکا اور برطانیہ میں ایسی بیماریوں کو ''سینڈروم آف گلف'' یعنی خلیج کی بیماری کہا جاتا ہے۔

کٹھ پتلی حکمران اور افسران اپنی ہی عراقی عورتوں مردوں بچوں اور بزرگوں پر دشمنوں کی طرح ظلم کر رہے تھے۔ ان کی نظروں میں صرف وطن کی ہی نہیں، دین اسلام کی بھی اہمیت نہیں رہی تھی۔ جبار القائدی بھی نام کا مسلمان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بصرہ کی عظیم الشان لائبریری میں چند نایاب اور قدیم مکتوبات ہیں۔ سات سو سال پہلے حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ پر جو کتاب لکھی گئی تھی، وہ اس کتب خانے میں موجود ہے۔ جبار اس کتاب کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں فروخت کر کے لاکھوں ڈالرز کما سکتا تھا۔

مارچ 2003ء کے بعد بصرہ میں ایسی بمباری ہوئی کہ وہ کتب خانہ کھنڈر بن گیا۔ قیمتی کتابیں اور قدیم نسخے تباہ ہو گئے۔ جبار وہاں دیر سے پہنچا۔ اس نے ملبے میں خزانہ تلاش کیا۔ اسے نبی کریمؐ کی حیات طیبہ پر کتاب نہیں ملی۔ معلوم ہوا کہ اس کتب خانے کا انچارج ایک بوڑھا تھا۔ اس بوڑھے نے بمباری سے پہلے حیات طیبہ سمیت قدیم نسخے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیے تھے۔ جبار کے لیے سرمایہ محفوظ تھا۔ وہ اسے حاصل کر سکتا تھا۔

وہ اس بوڑھے کے گھر پہنچا۔ وہاں اس کی میت رکھی ہوئی تھی۔ وہ بے چارہ بمباری کے دوران زخمی ہو گیا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا لیکن زخموں کی تاب نہ لا کر وہ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

جبار آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹیز کے طور پر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ لوگ آرمی اور پولیس والوں کے ظلم و ستم سے سہمے رہتے تھے۔ انہیں دیکھ کر محلے والے میت سے دور ہو گئے۔ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔

جبار نے اس کی بیوہ سے کہا۔ ''لائبریری کی کتابیں اس گھر میں لائی گئی ہیں، انہیں ہمارے حوالے کر دو۔''

خاتون نے کہا۔ ''کتابیں یہاں نہیں ہیں۔ کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچائی گئی ہیں۔''

سپاہیوں نے گھر کے ایک ایک حصے کی تلاشی لی۔ انہیں ایک بھی قدیم نسخہ نہیں ملا۔ جبار نے پوچھا۔ ''وہ اہم نسخے اور کتابیں کہاں پہنچائی گئی ہیں؟''

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی۔ میرا بیٹا پرویز جانتا ہے۔ بغداد میں کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ باپ کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے یہاں آ نہیں پا رہا ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''اس سے فون پر بات کراؤ۔''

خاتون نے اپنے فون کے ذریعے بیٹے سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''یہاں پولیس والے چھاپا مارنے آئے ہیں۔ لائبریری کے تمام اہم نسخے اور کتابیں طلب کر رہے ہیں۔ تلاشی لینے کے لیے ہمارے گھر کا تمام سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہاں تمہارے باپ کا جنازہ رکھا ہوا ہے۔ کندھا دینے والے ان کے خوف سے ...''

جبار نے اس سے فون چھین کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو... میں جبار القائدی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی بول رہا ہوں۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بتاؤ... قدیم نسخے اور نبی کریمؐ کی کتاب حیات طیبہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟''

پرویز نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ دینی سرمایہ ایمان والوں کے پاس محفوظ ہے۔ جب امریکی اتحادی فوجیں ہمارے ملک سے نکل جائیں گی، حالات سازگار ہوں گے تو حیات طیبہ سمیت تمام قدیم نسخے لائبریری میں واپس لائے جائیں گے۔''

''بکواس مت کرو۔ ساری کتابیں ابھی یہاں لاؤ۔ ہم انہیں حفاظت سے رکھیں گے۔''

''تم سب امریکا کے غلام ہو۔ اپنے ہی ملک کو کیسے لوٹ رہے ہو، یہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں محفوظ ذخیرے سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔''

''میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ ابھی پانچ منٹ کے اندر تمہاری ماں کو گولی مار دوں گا۔ اس کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً بولو... کتنے وقت میں میرے مطالبات پورے کرو گے؟''

''میری بوڑھی ماں پر ظلم نہ کرنا۔ لائبریری کا تمام سرمایہ مجاہدین کی تحویل میں ہے۔ میں وہاں سے ایک کتاب بھی نہیں لا سکوں گا۔''

جبار نے کہا۔ ''پانچ منٹ گزر گئے۔ اب ماں کی چیخ سنو۔''

پرویز نے فائر کی آواز کے ساتھ چیخ سنی۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر ماں کو آوازیں دینے لگا۔ جبار نے کہا۔ ''یہ

تمہاری آواز سے دور جا چکی ہے۔ اب یہاں سے ایک نہیں دو جنازے اٹھیں گے۔"

وہ غصے سے جبار کو گالیاں دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "یہاں کنددھا دینے تو آؤ گے ہی۔ تب گالیوں کا حساب کروں گا اور جب تک نہیں آؤ گے تب تک میتیں یہیں پڑی رہیں گی۔ تمہارا کوئی محلے پڑوس والا اِدھر آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔"

پرویز اکبر مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے غصے میں گالیاں دے کر اسے جانی دشمن بنا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ دشمن تھا اور کافروں سے بدتر تھا۔ اس نے کتاب حیاتِ طیبہ سے لاکھوں ڈالرز کمانے کے لیے ایک بوڑھی بیوہ کو قتل کیا تھا۔ اس گھر میں ایک میت کا اضافہ کیا تھا۔ بیٹا آتا تو تیسری میت کا بھی اضافہ کر دیتا۔

عجیب بے بسی تھی۔ محلے والے دور دور سے پرویز اکبر کے مکان کو دیکھ رہے تھے۔ دروازے کے باہر جنازہ تیار تھا۔ دوسری لاش گھر کے اندر پڑی تھی۔ قانون کے محافظ ڈاکو بن کر آئے تھے۔ وہ سب ہی مسلح تھے۔ ان کے ہتھیار گویا قتل کرنے کا لائسنس تھے۔ کوئی انہیں قانونی گرفت میں نہیں لا سکتا تھا۔

دوپہر سے شام ہو گئی۔ پرویز اکبر نے مجاہدین کو اپنے حالات بتائے اور ان سے پوچھا۔ "میرے والدین کی تدفین کیسے ہو گی؟ جبار میتوں کے قریب کسی کو جانے نہیں دے رہا ہے۔ رات گزر جائے گی پھر کل کا دن بھی گزر جائے گا۔ کیا وہ میتیں ویسے ہی رکھی رہیں گی؟"

مجاہدین جانتے تھے کہ جبار درندہ ہے۔ اس کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو وہ اس محلے میں بے گناہوں کی لاشیں گراتا رہے گا۔ انہوں نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر رات کی تاریکی میں اچانک اس محلے میں گھس آئے۔ جبار کی پولیس فورس پر ایسی گولیاں برسائیں کہ وہ تتر بتر ہو گئے۔

حملہ ان کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ جوابی فائرنگ کرتے ہوئے جانیں بچاتے ہوئے وہاں سے بھاگنے لگے۔ جبار کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ مجاہدین ان دونوں میاں بیوی کی لاشیں اپنی گاڑیوں میں ڈال کر لے گئے۔

جبار الفائدی اپنی طاقت اور ناجائز اختیارات سے کام لینے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ لاکھوں ڈالرز کمانے کے لیے کتاب حیاتِ طیبہ اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اس نے کئی ماہ بعد ایک موقع پر پرویز اکبر کو بھی گولی مار دی۔ یوں سات سو سال قبل لکھی ہوئی حیاتِ طیبہ کی حفاظت کرتے ہوئے اس خاندان کے تمام افراد شہید ہو گئے۔

اب وہ حارث کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ گورے آقاؤں نے کہا تھا' وہ اسے سلیمانیہ شہر سے باہر نکلنے نہ دے۔ اس سے پہلے ہی زندہ یا مردہ پکڑ کر لے آئے۔ لیکن اپنی مسلح فورس تیار کرتے ہوئے جبار کا کچھ وقت ضائع ہو گیا تھا اور حارث اس شہر سے بہت دور نکل آیا تھا۔

اس کا دشمن ایک جبار ہی نہیں تھا' پورے عراق کی آرمی اور پولیس والوں تک اس کی تصویریں پہنچائی گئی تھیں۔ سب ہی اپنے اپنے علاقوں میں محتاط اور مستعد ہو گئے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ مجاہدین کی فورس اور بھرپور اسلحہ ہے۔

مجاہدین کے مختلف گروہوں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہاں روپوش رہتے ہیں؟ وہ اپنی پناہ گاہیں بدلتے رہتے تھے۔ کچھ ایسے علاقے تھے جہاں آرمی اور پولیس والے حملے کرنے کے بعد بھاری نقصان اٹھا کر واپس آئے تھے۔ پھر انہوں نے جھنجلا کر وہاں مسلسل بمباری کی تھی۔ انسانی آبادی کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ ان کی پناہ گاہوں تک پہنچ نہیں پائے تھے۔

جبار کو یقین تھا کہ حارث کو کہیں مستقل پناہ نہیں ملے گی۔ پورے عراق میں اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ وہ صبح سے شام تک اپنے وسیع ذرائع استعمال کرتا رہا۔ جہاں سے بھی اس کی سن گن ملتی' وہ وہاں پہنچ جاتا تھا۔ آخر اس کی پولیس موبائل ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس آ کر رک گئی۔

ان سب نے گاڑی سے اتر کر دیکھا۔ ٹیلے کی بلندی پر وہ کانونٹ ایک مضبوط قلعے کی طرح دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جبار نے اپنے دستِ راست کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "زبیر! ہمارا شکار یہاں ہے۔"

زبیر نے کہا۔ "سر! اس کے احاطے میں کسی مرد کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوست ہو یا دشمن، کوئی اُدھر نہیں جاتا۔"

"بے شک... سب ہی اس عبادت گاہ کا احترام کرتے ہیں۔ کوئی مرد وہاں نہیں جاتا لیکن ایک مجرم کے لیے یہ چھپنے کی بہترین جگہ ہے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ حارث اور اس کے ساتھی یہاں اسلحے کے زور پر پناہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

"یہ کہو کہ پناہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہم یقیناً انہیں دبوچ لیں گے۔"

"کیا اندر جانے کے لیے فادر سے اجازت لینی ہو گی؟"

"اِدھر ہم اپنی آمد کی خبر دیں گے' اجازت لیں گے... اُدھر وہ ہوشیار ہو جائیں گے اور دوسرے راستوں سے فرار ہو جائیں گے۔"

"سمجھ گیا سر... ! ہم اس... وسیع چار دیواری میں چپ چاپ داخل ہوں گے۔"

"ہاں۔ پہلے اس کی بلند دیواروں کے چاروں طرف گھوم کر دیکھیں گے۔ فرار ہونے کے لیے کوئی بھی دوسرا دروازہ ہو گا تو اسے باہر سے بند کر دیں گے۔ پھر اندر جائیں گے۔"

یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حارث تین مجاہدین کے ساتھ ہے جبکہ جبار کے ساتھ دس مسلح سپاہی تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی زیادہ تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ حارث کو زندہ بچ کر جانے نہیں دے گا۔

شام کے سائے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے۔ ایک آدھ گھنٹے میں چاند نکلنے والا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے جدا ہو کر کانونٹ کے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ انہیں جلدی نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے رات کے کسی حصے میں شب خون مارنے والے تھے۔

وہاں حارث تو نہیں تھا مگر اس کی محبوبہ تھی۔ اتحادیوں سے اور اپنے ہی ملک کی پولیس سے چھپنے کے لیے راہبہ بن گئی تھی۔ وہاں فوج اور پولیس تو کیا' کوئی اعلیٰ حاکم بھی احاطے کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یاقوت کو اطمینان حاصل ہوا تھا کہ کانونٹ میں رہ کر دشمنوں کی گرفت میں نہیں آئے گی۔

اسی رات معلوم ہوا کہ آسمان سے گر کر کھجور میں آ کر اٹک گئی ہے۔ وہاں خلافِ توقع ایک دشمن پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے تقاضا کر رہا تھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھولے اور خود کو اس کے حوالے کر دے۔

پتا نہیں وہ کون تھا؟ یہ جانتا تھا کہ وہ آرمی اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اتحادیوں سے منہ چھپانے کے لیے وہاں چھپی ہوئی ہے۔ اگر اس کا مطالبہ پورا نہیں کرے گی تو دوسرے دن فادر اور مدر کے سامنے اس کا بھید کھل جائے گا۔ اسے کانونٹ سے نکال دیا جائے گا۔ پھر وہ دشمن اتحادیوں کی جھولی میں جا گرے گی۔

یاقوت نے بڑی مشکل سے ایک رات کے لیے اسے ٹالا تھا۔ یہ وعدہ کیا تھا کہ سوچے گی' سمجھے گی۔ اپنے حالات پر غور کرے گی۔ پھر دوسری رات خود کو اس کے حوالے کرے گی۔

اسے کیا سوچنا سمجھنا تھا؟ وہ مہلت لے کر وہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے اس امید پر مہلت حاصل کی تھی کہ شاید کسی طرح بچاؤ کا راستہ نکل آئے۔ ہو سکتا ہے' اس دشمن کو موت آ جائے وہ بھید کھولنے سے پہلے ہی مر جائے اور وہ اس کے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

اس کانونٹ میں صرف چار مرد تھے۔ ایک فادر' ایک کلرجی مین' ایک کانونٹ کا منتظم اور ایک اور شخص تھا جو ضرورت کا تمام سامان باہر سے لایا کرتا تھا۔ ان میں سے تین عراقی عیسائی تھے۔ صرف فادر کا تعلق یورپ سے تھا۔ یاقوت کو شبہ تھا کہ ان تین مقامی باشندوں میں سے کوئی ایک اس کا دشمن ہے۔

اس نے دوسرے دن سوچ لیا کہ جب بھی ان تینوں سے سامنا ہو گا تو وہ انہیں تاڑنے کی کوشش کرے گی۔ معلوم کرے گی' آخر کون اس کے پیچھے پڑ گیا ہے؟

فادر سے دن میں کئی بار سامنا ہوتا تھا۔ عبادت کے وقت کلرجی مین ان کے روبرو رہتا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی مرد کسی راہبہ کے قریب سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ ایسی جگہ اس دشمن کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔ یاقوت وہاں میریا کے ذریعے داخل ہوئی تھی۔

اس نے بائبل پڑھتے وقت دھیمی آواز میں میریا سے کہا۔ "کل رات کوئی میرے دروازے پر آیا تھا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا مگر آج کھولنا پڑے گا۔ وہ مجھے مفرور لیڈی ڈاکٹر یاقوت کی حیثیت سے جانتا ہے۔"

میریا نے بائبل پڑھنے کے انداز میں ذرا آگے پیچھے ہلتے ہوئے کہا۔ "اوہ گاڈ! پتا نہیں تم کس کی نظروں میں آ گئی ہو؟ میں تمہیں لائی ہوں۔ تمہارا بھید کھلے گا تو میری بھی شامت آ جائے گی۔"

یاقوت نے کہا۔ "اس شخص کو پہچان کر اس سے کوئی سمجھوتا کرو۔"

"میری اور اپنی بہتری چاہتی ہو تو اس کا مطالبہ پورا کرو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہے... میں جان دے دوں گی' اس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

"تم مر جاؤ گی۔ پولیس تفتیش کے لیے آئے گی۔ تم پہچانی جاؤ گی۔ مجھ پر الزام آئے گا کہ میں تمہیں یہاں چھپانے کے لیے لائی تھی۔ تم تو مرو گی' مجھے بھی لے مرو گی۔"

وہ زیادہ باتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ طے کیا کہ اس شخص

کو پہچان کر اس سے بات کی جائے گی۔ رات ہونے سے پہلے کسی طرح اسے ٹالنے کی کوشش کی جائے گی۔

وہاں چار مرد تھے۔ چاروں ہی پارسا دکھائی دیتے تھے۔ شرافت اور نیک نیتی کے باعث وہاں ان کی رہائش مستقل تھی۔ یاقوت اور میریا کسی پر انگلی نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ ان سے کبھی کبھی کسی ضرورت کے تحت سامنا ہوتا تھا۔ ایسے وقت بھی مدر بولتی تھی۔ راہبائیں خاموش رہتی تھیں۔

کچھ نہ ہو سکا' دن ڈھل گیا۔ رات ہوگئی۔ تمام راہبائیں رات نو بجے کھانے کے بعد اپنی اپنی کوٹھری میں چلی گئیں۔ یاقوت نے اپنی کوٹھری میں آکر دروازے کو اندر سے بند کرلیا اور تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ رات دس بجے سے پہلے لائٹ بجھا دینے کا حکم تھا۔ اس نے لائٹ آف کرکے زیرو پاور.... ایک بلب روشن کردیا۔

ایسے وقت اس کے اندر گھبراہٹ اور بے چینی نہیں تھی۔ جب یہ فیصلہ ہوجائے کہ مرنا ہے اور ہر حال میں مرنا ہے تو پھر سزائے موت پانے والے کے اندر ایک ذرا ٹھہراؤ آجاتا ہے کہ مرنا تو ہے ہی تو پھر ڈرنا یا رونا کس لیے...؟

وہ آنے والا بہت بے چین تھا۔ تمام کوٹھریوں کی لائٹس آف ہوتے ہی چلا آیا۔ دروازے پر بہت ہلکی سی "ٹھک" کی آواز سنائی دی۔

اس نے ادھر دیکھا۔ دروازے پر بنی ہوئی بالشت بھر کی کھڑکی کا پٹ بند تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے لگی۔ تب دوسری بار وہی ٹھک کی آواز سنائی دی۔

وہ تخت سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں آئی۔ پھر اس نے دروازے کو ایک انگلی سے بجایا۔ جواباً باہر سے پھر ویسی ہی دستک سنائی دی۔ یاقوت نے کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اس کی دھیمی سی بھاری بھرکم سرگوشی سنائی دی۔ "کھڑکی نہیں' دروازہ کھولو۔"

یاقوت نے کہا۔ "مجھ پر رحم کرو۔ میں بے حیا بدکار نہیں ہوں۔ مجھے بے داغ رہنے دو۔"

"کسی بے داغ سے کھیلنے پر فخر حاصل ہوتا ہے کہ اس عورت کے پہلے فاتح ہم ہیں۔"

"کیا تمہیں ایک ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ایک مجبور پر ظلم کررہے ہو؟"

"یہ باتیں اندر بھی ہوسکتی ہیں۔ دروازہ کھولو۔"

وہ بے بسی سے بولی۔ "ٹھیک ہے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی باہر جائے گی۔ پہلے میں لائٹ بجھاتی ہوں۔ بعد میں اسے آن کیا جائے گا۔"

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جاکر زیرو پاور کے بلب کو بجھا دیا۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ گہری پُراسرار تاریکی میں خود کو اپنا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دونوں عارضی طور پر اندھے ہوگئے تھے۔

پھر اندھے کو معلوم ہوا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ یاقوت کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ "آجاؤ... سیدھے تین قدم آگے جاؤ۔ میں دروازہ بند کرنے کے بعد لائٹ آن کروں گی۔"

وہ اندر آکر تین قدم چلتے ہی تخت سے ٹکرا گیا۔ وہاں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایسے وقت دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "سوئچ بورڈ کہاں ہے؟ لائٹ آن کرو۔"

اسے جواب نہیں ملا۔ کوٹھری میں گہری تاریکی اور خاموشی رہی۔ روشنی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "کہاں ہو تم؟"

تب دروازے پر ہلکی سی ٹھک کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "دروازہ کیوں بجا رہی ہو؟ یہاں آؤ۔ لائٹ آن کرو۔"

پھر وہی ٹھک کی آواز ابھری۔ اس نے سوچا' کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ فوراً ہی تخت سے اتر کر اندھے کی طرح دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر ایک دیوار کے پاس آیا۔ ادھر اُدھر ہاتھ مارنے پر سوئچ بورڈ مل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں زیرو پاور کی روشنی جل اٹھی۔

مچھلی ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔ کوٹھری اس کے وجود سے خالی تھی۔ اس نے تخت کے نیچے جھانک کر دیکھا پھر دروازے کے پاس آکر اسے کھولنا چاہا۔ وہ کھل نہ سکا۔ باہر سے بند ہوچکا تھا۔

آپ اپنے دام میں صیاد آگیا...

اس نے بالشت بھر کی کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر تاریکی تھی' وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ "اب تم پنجرے میں ہو۔ باہر کیسے آؤ گے؟"

وہ غصے سے دانت پیس کر بولا۔ "دروازہ کھولو... ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔"

"پہلے تنہا پچھتاتی' تنہا ماری جاتی' اب تمہیں اپنی صفائی میں بیان دینا ہوگا کہ میری کوٹھری میں کیسے پہنچ گئے؟"

"میں کہہ دوں گا کہ تمہیں مفرور ملزمہ کے طور پر جانتا تھا۔ تم نے مجھے بدنام کرنے کے لیے یہاں دھوکے سے بلا کر قید کردیا ہے۔"

"پوچھا جائے گا' جب میری اصلیت جانتے تھے تو مدر اور فادر کو رپورٹ کیوں نہیں دی؟ پولیس کو انفارم کیوں نہیں کیا؟ میری کوٹھری میں کیوں چلے آئے؟"

"بکواس مت کرو۔ میں خود کو کسی طرح بچالوں گا۔ تم ماری جاؤ گی۔"

"میری فکر نہ کرو۔ خود کو بچاؤ۔ چیخو چلاؤ۔ دروازہ کھولنے کے لیے فادر اور مدر کو آوازیں دو۔ میں جارہی ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں... تم نہیں جاسکتیں۔ رک جاؤ۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔"

"تم نے کیا سمجھوتا کیا تھا؟ کسی بے داغ عورت سے کھیل کر فخر حاصل کرتے ہو نا؟ فخر کرو... آؤ! میرے فاتح بنو۔"

"پلیز یاقوت! عقل سے کام لو۔ تمہاری نادانی سے ہم دونوں ڈوبیں گے۔ تمہاری ذہانت اور سمجھوتے سے دونوں کو امان ملے گی۔ میں یہاں تمہارا بھید نہیں کھولوں گا۔"

"میں نادان بچی نہیں ہوں۔ تمہاری کمینگی اور خباثت کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ دروازہ کھلتے ہی تم پھر گیدڑ سے شیر بن جاؤ گے۔"

"اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ یہاں سے نکل پاؤ گی تو یہ ممکن نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "میرے لیے باہر موت ہے۔ اس لیے مدر کے پاس جارہی ہوں۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تمہارا راز نہیں کھلے گا۔ ہم یہاں دوست بن کر رہیں گے۔ مدر کے پاس جاکر اپنا بھید نہ کھولو۔ میں تمہارا رازدار بن کر رہوں گا۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "میری باتیں سن رہی ہو؟ جواب دو..."

باہر خاموشی رہی۔ اس نے کہا۔ "یاقوت...! او تو۔ تم یاقوت نہیں ہو۔ یہاں تمہارا نام مریم ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ تم یاقوت ہو۔ پلیز! دروازہ کھولو..."

باہر چاند آیا تھا۔ کوٹھری کی طرف دھیمی دھیمی سی چاندنی جھلک رہی تھی۔ وہ بالشت بھر کھڑکی سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب بھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ جاچکی تھی۔ شکاری شکار ہوکر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

مدر مارتھا سونے سے پہلے کھڑکی کے پاس آئی تھی۔ وہاں سے احاطے کی اونچی دیواریں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ ایک سمت چرچ نظر آرہا تھا۔ دوسری طرف خانقاہ تھی۔ وہ فادر اور کلرجی مین کی رہائش گاہ بھی تھی۔ چاندنی میں دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ ایسے وقت مدر نے چونک کر دیکھا چند مسلح اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔

دو اجنبی احاطے کی دیوار سے لگ کر دبے قدموں چلتے ہوئے چرچ کی طرف جارہے تھے۔ تین مسلح افراد نے خانقاہ کا رخ کیا تھا' وہ سائے کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور راہباؤں کی کوٹھریوں کی طرف جارہے تھے.... صورتِ حال کہہ رہی تھی کہ اس کانونٹ کا تقدس پامال ہونے والا ہے۔

وہاں صرف فادر اور مدر کے پاس موبائل فون رہتا تھا۔ مدر نے فوراً ہی فادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے مسلح اجنبیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ پتا نہیں یہ کون ہیں؟ ہمارے کانونٹ میں گھس آئے ہیں۔"

فادر نے کہا۔ "آرمی یا پولیس والے ہوں گے۔ آج صبح سلیمانیہ کے ڈیتھ ہاؤس کو بم دھماکے سے کھنڈر بنادیا گیا ہے۔ سزائے موت پانے والے کئی قیدی فرار ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ انہیں تلاش کرتے آئے ہوں گے۔"

"انہیں اجازت لے کر اندر آنا چاہیے تھا۔"

فادر نے کہا۔ "معاملات زیادہ سنگین ہوں تو اجازت حاصل نہیں کی جاتی۔ اچانک چھاپے مارے جاتے ہیں۔ فکر نہ کرو، میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔"

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ مدر نے ادھر جاتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

یاقوت کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں... مریم۔ پلیز! دروازہ کھولیں۔"

وہ سچ بولنے آئی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ جھوٹ کھلنے والا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنی روداد سنا کر مدر کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مدر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "گاڈ بلیس آن یو۔ تم اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں بہت گھبرا رہی ہوں۔ یہاں کئی مسلح اجنبی گھس آئے ہیں۔"

یہ ایسی بات تھی کہ یاقوت بھی گھبرانے لگی۔ اپنی بات کہنا بھول گئی۔ اس نے پوچھا۔ "مسلح افراد یہاں کیسے آگئے؟ کیا وہ آرمی اور پولیس والے ہیں؟"

"فادر یہی کہہ رہے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں' وہ باغی دہشت گرد ہوں گے تو کیا ہوگا؟"

اور یاقوت سوچ رہی تھی' وہاں گھس آنے والے آرمی اور پولیس کے آدمی ہوں گے تو کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ اسے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔ جانور کی طرح اس کے گلے میں پھندا ڈال کر لے جائیں گے۔

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”مدر! وہ کوئی بھی ہوں... سب کے سب مرد ہیں۔ ہم راہباؤں کے ساتھ زیادتی کریں گے۔ یہاں کوئی ہماری عزت بچانے نہیں آئے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ہاں۔ مجھے بھی یہی فکر ہے۔ میں اور فادر کانونٹ کے تقدس کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ میرے لیے کچھ کر سکتی ہیں؟ اگر اس الماری کے اندر جگہ ہے تو میں چھپ جاؤں گی۔“

بیڈ کے ایک بڑے سے ٹوکرے میں ڈھیر سارے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ مدر نے کہا۔ ”تم اس کے اندر چھپ سکتی ہو۔ کوئی شبہ نہیں کرے گا۔“

مدر نے ٹوکرے میں سے کپڑے باہر نکالے۔ یاقوت اس کے اندر جا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ مدر نے تمام کپڑے اس پر ڈال دیے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ باہر سے جبار القائدی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

”دروازہ کھولو... ورنہ توڑ دیا جائے گا۔“

مدر نے کہا۔ ”ویٹ مائی سن ایسوع تمہیں سکون دے۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔“

اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا، باہر سے ایک لات پڑی۔ وہ دروازہ مدر کے منہ پر آ کر لگا۔ وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔ جبار دو سپاہیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر آیا پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

مدر کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ اشارے سے بولی۔ ”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کمرے میں نہیں ہے لیکن اس عمارت میں کہیں ہے۔“

سپاہی بیڈ کے نیچے اور مختلف سامان کے پیچھے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے الماری کھول کر دیکھی۔ ایک سپاہی نے کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹوکرے کو لات ماری۔ وہ ٹوکرا ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ لات مارنے والے کو اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ بھاری ہے۔

مدر نے بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”مائی سن! تم کسے تلاش کر رہے ہو؟“

جبار ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ ”وہ کتا ہے۔ اس کا نام حارث ہے۔ اسے موت کی سزا ملنے والی تھی مگر وہ ڈیتھ ہاؤس سے فرار ہو گیا ہے۔“

یہ بات ایسی تھی کہ یاقوت ٹوکرے کے اندر بیٹھے بیٹھے خوشی سے لرز گئی۔ باہر ہوتی تو ناچنے لگتی۔ وہ پھر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ یہ بھول گئی کہ خود سلامتی کی محتاج ہے۔

ایسے ہی وقت تڑاتڑ فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ جبار نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے، میرے رائٹ ہینڈ زبیر نے دشمن کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یقیناً حارث کے آدمیوں سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔“

اس کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بولو زبیر! کیا وہ نظروں میں آ گیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”نو سر! ہم اس کی نظروں میں تھے۔ اچانک ہی اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہمارے چار سپاہی مارے گئے ہیں۔ میں اس وقت چرچ میں چھپا ہوا ہوں۔ معلوم کر رہا ہوں، وہ عمارت کے کس حصے میں ہوگا؟“

جبار نے کہا۔ ”تم اُدھر سے اسے گھیرو۔ میں اِدھر سے آ رہا ہوں۔ اسے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“

وہ فون پر بولتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مدر نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ٹوکرے سے کپڑے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”وہ جا چکے ہیں۔ بہت ہی ظالم ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے، یہ لوگ ایک مدر کا بھی احترام نہیں کرتے وردی پہن کر فرعون بن جاتے ہیں۔“

وہ ٹوکرے سے باہر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور حارث کے لیے پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ ’وہ تنہا ہوگا، پتا نہیں پولیس والے کتنی تعداد میں ہیں؟ کیا وہ یہاں سے نکل پائے گا؟

’وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا مجاہدین نے اسے بتایا ہے کہ میں یہاں رہتی ہوں؟

’یقیناً بتایا ہوگا اور وہ دیوانہ خطرات مول لے کر مجھ سے ملنے چلا آیا۔‘

وہ بڑے فخر سے سوچ رہی تھی۔ ’اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہاں مدر کے کمرے میں ہوں۔ وہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟ اسے یہاں کیسے بلاؤں؟‘

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔ ’کیا میں اسے ڈھونڈنے کے لیے جاؤں؟‘

پھر فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ آوازیں سمجھا رہی تھیں کہ مدر کے کمرے سے باہر جانا بہت بڑی حماقت ہوگی۔ باہر جبار کے فون پر کالنگ ٹون سنائی دی۔ پھر وہ فون پر کہنے لگا۔ ”ہاں زبیر! بولو۔“

وہ بڑے فخر سے بولا۔ ”سر! میں نے حارث کے ایک آدمی کو مار دیا ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ویل ڈن۔ یہ معلوم کرو کہ حارث کہاں ہے؟“

”میں جگہ بدل رہا ہوں۔ جلد ہی اسے نشانے پر لے آؤں گا۔“

اچانک ہی قریب سے گولیاں چلنے لگیں۔ وہ چھلانگ لگا کر ایک ستون کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دور تک دیکھا تو دل ڈوبنے لگا۔ چاند کی روشنی میں اس کے تین سپاہیوں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔

ابھی زبیر نے خوش خبری سنائی تھی کہ حارث کا ایک ساتھی مارا گیا ہے اور چند منٹوں میں ہی اس کے تین سپاہی مارے گئے تھے۔ ان سے پہلے چار مر چکے تھے۔ اب وہ دس میں سے تین رہ گئے تھے۔

عقل کہہ رہی تھی کہ حارث کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ بڑی کامیابی سے چھپ کر حملے کر رہا تھا۔ اب تک کے نتائج سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان سب کو جہنم میں پہنچا کر وہاں سے فرار ہو جائے گا۔

اب جبار کو مزید سپاہیوں اور ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ وہ ایک کال کرتا اور یہ اطلاع دیتا کہ حارث مجاہدین کے ساتھ کانونٹ میں چھپا ہوا ہے تو آرمی والے آ کر اس عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیتے۔

اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے تو معلوم ہوا، بیلنس ختم ہو چکا ہے۔ وہ کال وصول کر سکتا تھا، کر نہیں سکتا تھا۔ فی الوقت کسی کو مدد کے لیے طلب نہیں کر سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ زبیر اسے کال کرتا، تب اس کے ذریعے آرمی یا پولیس والوں کو مدد کے لیے بلایا جاتا۔ فی الحال بدترین حالات کا سامنا تھا۔

حارث عمارت کے اس حصے میں تھا جہاں راہباؤں کے لیے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں تک چاند کی روشنی پہنچ نہیں رہی تھی۔ دور تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تاریکی میں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ محتاط انداز میں آس پاس دیکھتا ہوا دبے قدموں ایک سمت جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ٹھٹک گیا۔ ایک کوٹھری کے دروازے کے سامنے رک گیا۔

اس دروازے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر زیرو پاور کے بلب کی بجھی بجھی سی روشنی تھی۔ وہاں سے کسی مرد کی سرگوشی سنائی دی۔ ”جسٹ آ منٹ۔ پلیز! میری مدد کرو۔“

حارث نے خود کو چھپاتے ہوئے بالشت بھر کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا پھر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ باہر کیوں نہیں آ رہے ہو؟“

”یہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ پلیز! اسے کھولو۔“

حارث نے جھک کر دیکھا۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کس نے تمہیں بند کیا ہے؟“

”میں تمہیں بتاؤں گا۔ پہلے باہر نکالو۔“

”پہلے بتاؤ۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم دوست ہو یا دشمن؟ تمہیں میرے آدمیوں نے قید کیا ہے یا میرے دشمنوں نے؟“

”دشمن ہی مارتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ کسی دشمن نے مجھے قید کیا ہے۔“

حارث نے اتنا تو سمجھ لیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ اصل بات بتائے بغیر باہر آنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ”ہم پولیس والے ہیں۔ یہاں باغیوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ سچ بولو، کیا تم باغیوں کے ساتھی ہو؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں... میں تو کلرجی مین ہوں۔ امریکی اتحادیوں کا تابع دار...“

حارث نے کہا۔ ”میں دیکھتا آ رہا ہوں، یہاں تمام کوٹھریوں میں راہبائیں رہتی ہیں۔ تم ایک نن کی کوٹھری میں کیسے قید ہو گئے؟“

اس نے کہا۔ ”میں ایک باغی دہشت گرد لڑکی کو پہچان گیا تھا۔ اس کے خلاف رپورٹ کرنے والا تھا۔ وہ مجھے دھوکے سے یہاں بند کر کے چلی گئی ہے۔ میں یہاں سے نکلتے ہی اسے گرفتار کراؤں گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ لڑکی؟ ابھی کہاں ہوگی؟“

”اس کا نام یاقوت ہے۔ وہ آرمی اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ یہاں آ کر چھپی ہوئی تھی۔ ابھی فائرنگ ہو رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں جا کر دبک گئی ہوگی؟“

حارث نے ایک گہری سانس لی۔ دل کی دھڑکنیں مچلنے لگیں۔ اسے ایک مجاہد نے فون کے ذریعے بتایا تھا کہ یاقوت نے دشمنوں سے چھپنے کے لیے کانونٹ میں پناہ لی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ یاقوت کو فی الحال وہیں روپوش رہنا چاہیے۔ لیکن حارث نے اس پہاڑی ٹیلے کے قریب سے گزرتے وقت ایک جگہ پولیس وین دیکھی۔ اس گاڑی کے نمبر پڑھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جبار القائدی اس نمبر کی موبائل میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

وہاں اس گاڑی کی موجودگی سے حارث نے سمجھ لیا کہ جبار اسے اور یاقوت کو تلاش کرنے کانونٹ کے اندر گیا ہے۔ تب ہی وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر ان سے مقابلہ کر رہا تھا۔

اب وہ جگہ اس کی یاقوت کے لیے محفوظ نہیں رہی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اب اس کی کوٹھری تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ نہیں تھی' وہاں اس کا رقیب تھا۔

اس نے کہا۔ ''میں دروازہ کھولنے سے پہلے جاننا چاہتا ہوں کہ ایک لڑکی نے تمہارے جیسے ہٹے کٹے مرد کو یہاں کیسے بند کردیا؟ تم چاہتے تو مدر اور فادر کو بلا لے آتے، اس کا بھید کھول دیتے لیکن تم تنہا اس کی کوٹھری میں کیوں آئے؟ صاف اور سیدھی بات بولو۔ تم بُرے ارادے سے آئے تھے؟''

''یہی سمجھ لو... دروازہ تو کھولو۔''

''میں سننا چاہتا ہوں' اس نے اپنی عزت کیسے بچائی؟ وہ باہر نکل گئی' تم اندر کیسے رہ گئے؟ پہلے بتاؤ پھر دروازہ کھلے گا۔''

اس نے مجبور ہوکر بتایا کہ یاقوت نے کیسی چال چلی تھی؟ کوٹھری میں اندھیرا کیا تھا۔ اسے اندر بلایا تھا۔ پھر تاریکی میں باہر نکل کر اسے وہاں قیدی بنا دیا تھا۔ حارث سن رہا تھا اور اپنی محبوبہ کی ذہانت پر فخر کر رہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''ایک لڑکی نے الو بنادیا۔ کیا تمہیں شرم آرہی ہے؟''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''اس نے دھوکا دیا۔ میں سمجھ نہیں پایا۔ اب یہاں سے جاتے ہی اس کتیا کی اصلیت ظاہر کروں گا تو...''

اس کی بات پوری نہ ہوسکی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ وہ ٹکرا کر ذرا پیچھے گیا۔ حارث نے اس کا نشانہ لے کر کہا۔ ''تو نے میری جان کو گالی دی ہے۔ اس منہ سے دی ہے۔''

اس نے منہ پر گولی ماری۔ وہ اچھل کر فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اس نے دوسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ گولیاں چلنے کی آواز گونجی تھی۔ دشمن ادھر آسکتے تھے۔ وہ فوراً ہی اندھیرے میں چھپتا ہوا وہاں سے دور چلا آیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں چرچ' خانقاہ' راہباؤں کی رہائش گاہیں اور لائبریری وغیرہ کہاں ہیں؟ وہ اندازے سے بھٹک رہا تھا۔ کسی طرح جبار تک پہنچ کر اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک جگہ تاریکی میں رک گیا۔ ایک دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آرہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ یقیناً وہ زخمی تھا۔ آگے چل نہیں سکتا تھا۔ وہیں حارث کے قریب ایک چبوترے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

ذرا سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر جبار کی آواز سنائی دی۔ ''زبیر! تم کہاں ہو؟ میں بڑی دیر سے تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے فون میں بیلنس نہیں ہے۔ تم فوراً ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہماری پوزیشن بہت کمزور ہے۔ حارث یہاں سے نکل بھاگے گا۔ فوراً کانونٹ کو گھیر لیا جائے۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ ہماری پوزیشن بہت کمزور ہوگئی ہے۔ صرف ہم دو رہ گئے ہیں اور میں زخمی ہوگیا ہوں۔ ایک گولی میری پسلی توڑ کر نکل گئی ہے۔ مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔''

''وقت ضائع نہ کرو۔ فون کرو۔ ہماری پولیس فورس کے ساتھ تمہارے لیے ایمبولینس بھی آجائے گی۔''

''آل رائٹ۔ میں ابھی ہیڈ کوارٹر سے امداد طلب کرتا ہوں۔''

اس نے جبار سے رابطہ ختم کیا۔ اس کے بعد ہیڈ کوارٹر کے نمبر پنچ کرنا چاہتا تھا، اس سے پہلے ہی حارث نے ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور بڑی سفاکی سے کہا۔ ''کال نہ کرو۔ ورنہ موت تمہیں کال کرے گی۔''

اس نے سہم کر فون بند کردیا پھر کہا۔ ''تم نے کسی [illegible] نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے بھی نہیں چھوڑو گے۔ پھر بھی پوچھ رہا ہوں، کوئی سمجھوتا ہوسکتا ہے؟''

حارث نے کہا۔ ''پتا نہیں تم کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو... اب مرنے سے ڈر رہے ہو؟''

''میں ڈرتا نہیں ہوں۔ موت تو کسی بھی وقت، کسی بھی بہانے سے آسکتی ہے۔ پھر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہاں اچانک آجائے گی۔''

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''مجھے فوری طبی امداد نہ ملی تو مرجاؤں گا یا ابھی تم مار ڈالو گے۔ لیکن گھر جانے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ہم انسان ہیں مگر حیوان سے بدتر ہیں۔ ہمارے جیسے ظالموں کے گھروں میں بھی پیار و محبت کے رشتے ہیں۔ میری امی کی سالگرہ ہے۔ کل صبح وہ پورے سو برس کی ہوجائیں گی۔''

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے دودھ پلانے والی سو برسوں سے زندہ ہے اور میں پچیس برس کی عمر میں فنا ہونے والا ہوں۔''

حارث نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم ماں کے دودھ کو اور انسانی لہو کو پانی کرتے آرہے ہو۔''

''میں نے جو کیا' اس پر ندامت کا اظہار نہیں کروں

گا۔ اگر یہ میرا آخری وقت ہے تو راہِ راست پر آنے کی مہلت چاہوں گا۔''

''ہوں... کیا چاہتے ہو؟''

''امی کی گود میں سر رکھنا چاہتا ہوں۔ کل وہ سو برس کی ہوجائیں گی۔''

''شیطان کو مارو' تمہاری یہ خواہش پوری ہوجائے گی۔ مجھے جبار تک پہنچاؤ۔ میں تمہیں ماں تک پہنچاؤں گا۔''

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے فون کرنے دو۔ میں جبار سے بات کرتا ہوں۔''

حارث نے اجازت دے دی۔ اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں زبیر! بولو... کیا ہیڈ کوارٹر سے مدد آرہی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''ہاں۔ وہ آنے والے ہیں۔ اب ہمیں ایک جگہ ہونا چاہیے۔ آپ ابھی کہاں ہیں؟''

''میں خانقاہ میں ہوں۔ یہاں دشمن آسکتے ہیں اس لیے مدر کے کمرے کی طرف جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ادھر آرہا ہوں۔''

اس نے فون بند کردیا۔ حارث فون سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم میرے آدمیوں کی نگرانی میں رہوگے۔ اپنا فون مجھے دو۔ ہم یہاں سے جاتے وقت یہ تمہیں واپس کردیں گے۔ پھر تم ہیڈ کوارٹر فون کرکے امداد طلب کروگے۔''

زبیر نے کہا۔ ''وہ لوگ یہاں آکر پوچھیں گے کہ صرف میں کیسے زندہ رہ گیا؟''

''وہ ایسا احمقانہ سوال نہیں کریں گے۔ تم نے گولی کھائی ہے۔ تم زخمی ہو' وہ تمہیں اسپتال پہنچائیں گے۔ وہاں سے تم اپنی ماں کے پاس جاسکو گے۔''

حارث نے اپنے فون کے ذریعے دو ساتھیوں کو بلایا۔ زبیر کو ان کے حوالے کیا۔ انہیں سمجھایا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ احاطے کے مین گیٹ پر انتظار کریں۔ وہ جلد ہی ادھر آئے گا۔

اسے یاقوت تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ آخری دشمن کو ختم کیے بغیر اسے آزادی اور بے باکی سے تلاش نہیں کرسکتا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا خانقاہ کی طرف آیا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ مدر کی رہائش گاہ کہاں ہے؟

وہ ایک تاریک راہداری سے گزرتے وقت رک گیا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا' وہ اس اندھیرے میں تنہا نہیں ہے۔

وہ ایک دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر سن گن لینے لگا۔ گہری تاریکی' گہری خاموشی تھی۔ کوئی نہیں تھا۔ اس کا وہم ہوسکتا تھا لیکن وہ چوکنا رہنے کا عادی تھا۔ اپنی چھٹی حس کو اہمیت دیتا تھا۔ جہاں تھا' وہیں جم کر خاموش کھڑا رہا۔

ایسے وقت پھر اسے محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیسے دشمن کی موجودگی کا یقین کرے؟ اگر اس کی موجودگی معلوم نہیں ہوگی تو وہ آگے بڑھتے ہی، آہٹ پیدا کرتے ہی مارا جائے گا۔

تب عقل نے کام کیا۔ اس نے زبیر کا فون جیب سے نکال کر اسے کال کی۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد ہی اس دروازے کے پیچھے سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ حارث نے ریوالور سنبھالتے ہوئے ادھر دیکھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ جبار کے فون کی ننھی سی اسکرین روشن تھی۔ وہ اسے کان سے لگا کر کہہ رہا تھا۔ ''ہاں زبیر! بولو۔''

حارث نے اس روشن اسکرین سے اندازہ کیا پھر اسے نشانے پر لیتے ہوئے کہا۔ ''میں بول رہا ہوں۔ گولی کی زبان سے...''

اس نے یہ کہتے ہی گولی چلادی۔ وہ اچھل کر فرش پر گرا۔ سنسناتی ہوئی گولی دل کے قریب پیوست ہوگئی تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ یہ ایسا اچانک حملہ تھا کہ وہ اپنا ہتھیار استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ حارث دروازے کو پوری طرح کھولتا ہوا اندر آگیا۔ چاندنی کے مدھم سے اجالے میں وہ فرش پر سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

حارث نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی زندگی میں بڑے شیطانی کھیل کھیلے ہیں۔ ایک بوڑھے نے حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ پر لکھی ہوئی کتاب کو ایک محفوظ مقام پر پہنچایا تھا لیکن تم نے اس کے ذریعے ڈالرز کمانے کے لیے اس بوڑھے کے خاندان کے تمام افراد کو شہید کردیا۔ میں ان شہیدوں کو سلام کرتے ہوئے تمہیں جہنم رسید کر رہا ہوں۔''

اس نے کئی گولیاں چلائیں۔ سب کی سب اس کے ناپاک وجود میں اتار دیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

یاقوت اور مدر بری طرح سہم گئی تھیں۔ اس بار بالکل قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ مدر نے کہا۔ ''خدا ہم پر رحم کرے۔ ہمارے دروازے کے پاس فائرنگ ہورہی ہے۔ وہ لوگ یہاں آگئے ہیں۔''

یاقوت نے کہا۔ ''میں لائٹ آف کرتی ہوں۔ یہاں اندھیرا رہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔''

مدر نے کہا۔ ”اندھیرے میں میری جان نکل جائے گی۔“

”کیا آپ جانتی ہیں، وہ یہاں آئیں؟“

”وہ یہاں آکر جاچکے ہیں۔ اب نہیں آئیں گے۔“

وہ دونوں زیرِ لب دعائیں مانگنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ یاقوت اچھل کر کھڑی ہوگئی اور دوڑتی ہوئی بڑے سے ٹوکرے کے پاس آگئی۔ وہاں سے کپڑے ہٹا کر اندر بیٹھ گئی۔ مدر نے اس پر تمام کپڑے ڈال دیے۔ دوسری بار دستک کے ساتھ حارث کی آواز سنائی دی۔ ”پلیز! دروازہ کھولو۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

وہ آواز یاقوت کے دل تک پہنچی لیکن ذرا سا شبہ ہوا۔

”کیا ابھی میں نے حارث کی آواز سنی ہے؟“

مدر نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آکر بولا۔ ”معزز مدر! آپ یہاں کی تمام نن کو جانتی ہیں۔ کل یہاں ایک لڑکی نن بنے....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ یاقوت خوشی سے چیختی ہوئی ٹوکرے سے اٹھی۔ تمام کپڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ بھول گئی کہ ٹوکرے کے اندر ہے۔ اس نے تیزی سے محبوب تک پہنچنے کے لیے ایک قدم بڑھایا تو وہیں اٹک گئی۔ توازن قائم نہ رکھ سکی۔ اوندھے منہ گرنے لگی۔ حارث نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ کھینچ کر بازوؤں میں بھینچ لیا۔ وہ خوشی سے باؤلی ہورہی تھی۔ وہ بھی کم باؤلا نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیوانہ وار چومنے لگے۔

مدر نے منہ پھیر کر کہا۔ ”اوتو.... یہ گناہِ عظیم ہے۔ یہ نن بن چکی ہے۔ توبہ کرو۔“

توبہ اور کیسے کی جاتی ہے؟ لمبی جدائی سے توبہ....

انہوں نے اب تک ایک دوسرے کے بغیر جو عمر گزاری، اس گزر بسر سے توبہ....

وہ اپنے حالات کے مطابق توبہ کررہے تھے اور مدر اپنے اصولوں کے مطابق منہ پھیر کر توبہ کررہی تھی۔

☆☆☆

جواد اپنی مما اور ڈیڈ کے ساتھ ذلیل ہوکر محل سے نکالا جارہا تھا۔ داؤد نے حکم دیا تھا کہ وہ تینوں انیکسی میں جاکر رات گزاریں پھر دوسرے دن منہ دکھائے بغیر وہاں سے چلے جائیں۔

بیٹے نے غلطی کی تھی۔ وہ بے آبرو ہوکر وہاں سے جاسکتے تھے مگر جانا نہیں چاہتے تھے۔ سارہ جس کے گھر دلہن بن کر جاتی، جہیز میں لاکھوں کروڑوں ڈالرز کی جائداد لے جاتی اور وہ عراق میں پھیلی ہوئی دولت اور جائداد سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

وہ تینوں سر جھکائے بیرونی دروازے کے پاس آکر رک گئے۔ دروازہ بند تھا۔ باہر ایک خسرہ گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ وہ داؤد کا حکم سنے بغیر دروازہ کھول کر انہیں محل سے باہر نکلنے نہ دیتا۔

باپ نے بیٹے کو غصے سے دیکھ کر کہا۔ ”کیا تجھے عقل آرہی ہے کہ تیری حماقت سے ہم ذلیل ہورہے ہیں اور لاکھوں کروڑوں ڈالرز ہار کر جارہے ہیں؟“

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ”میں ابھی کچھ نہیں بولوں گا۔ بولوں گا تو آپ گالیاں دیں گے۔“

ماں نے بیٹے کو ہمدردی سے دیکھا۔ پھر اس کے باپ سے کہا۔ ”حماد! جو ہوا اس پر مٹی ڈالو۔ ہم یہاں سے جارہے ہیں، بھائی جان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو دوبارہ آکر انہیں منالیں گے۔“

حماد نے کہا۔ ”بلقیس! میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ بات بہت بگڑ چکی ہے۔ میں بنا کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔“

”وہ بہت غصے میں ہیں۔ تمہاری کوئی بات ان پر اثر نہیں کرے گی۔ ابھی کچھ نہ بولو تو اچھا ہے۔“

جواد نے کہا۔ ”یہ دروازہ کب کھلے گا؟ کیا ہم صبح تک یہاں کھڑے رہیں گے؟“

بلقیس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے، بھائی جان گارڈز کو حکم دینا بھول گئے ہیں۔“

حماد نے کہا۔ ”میں جاکر دیکھتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں؟“

وہ وہاں سے چلتا ہوا سارہ کے کمرے کی طرف آیا۔ خیال تھا، داؤد بیٹی سے باتیں کررہا ہوگا لیکن وہاں خاموشی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ وہ قریب آکر دستک دے کر پوچھنا چاہتا تھا کہ بھائی جان کہاں ہیں؟

پھر اس نے سوچا، کیا دروازہ کھلوانا مناسب ہوگا؟ ابھی وہاں سے ذلیل کرکے نکالا گیا ہے۔ سارہ سے سامنا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ پھر ایک دم سے رک گیا۔ اندر سے ایک مردانہ ہنسی سنائی دی۔ وہ ہنسی اس کے بھائی جان کی نہیں تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کو گھورنے لگا۔ ہنسی گم ہوگئی تھی۔ پھر ویسی ہی مترنم آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

”کیوں ہنس رہے ہو؟“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہم گھر والوں کو اُلّو بنارہے ہیں اور وہ آسانی سے بن رہے ہیں۔ کیا اس بات پر ہنسی نہیں

آئے گی؟“

وہ مٹھیاں بھینچ کر دروازے کو گھور گھور کر یوں دیکھنے لگا جیسے چور پھندے میں آگیا ہو اور وہ اسے دبوچنے ہی والا ہو۔

وہ دروازے پر ہاتھ مار کر اسے کھلوانا چاہتا تھا۔ پھر ایکدم سے رک گیا۔ ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اچھا تو یہ کھیل کھیلا جارہا ہے....؟“

یہ آواز اندر سے آئی تھی۔ پھر بیک گراؤنڈ میوزک کا شور سنائی دیا۔ حماد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”او گاڈ! ٹی وی آن ہے۔ کوئی ڈراما چل رہا ہے۔ ابھی اپنے بیٹے کی طرح میں بھی سارہ پر شبہ کرنے والا تھا۔ تھینکس گاڈ! میں بہت بڑی غلطی کرنے سے بچ گیا۔ ورنہ پھر ایک بار ذلیل ہونا پڑتا۔“

وہ دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ’اگر میں کسی طرح سارہ کو منالوں تو بھائی جان بھی مان جائیں گے۔ ہمیں معاف کردیں گے۔‘

اس نے دروازے پر دستک دی۔ سارہ نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

وہ بڑے پیار سے بولا۔ ”میری بیٹی! میں ہوں۔“

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ وہ سر جھکائے ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ سارہ نے پوچھا۔ ”آپ اندر آنا چاہتے ہیں.... پھر تلاشی لینا چاہتے ہیں؟“

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اپنے انکل کو شرمندہ نہ کرو۔ غلطی بیٹے نے کی، شرمندگی ہمیں ہورہی ہے۔“

”آپ نے بھی شبہ کیا تھا۔“

”میری مت ماری گئی تھی کہ بیٹے کی باتوں میں آگیا تھا۔ یاد ہوگا، تمہارا بچپن میری گود میں گزرا ہے۔ تم جس کندھے پر بیٹھتی تھیں.... وہ کندھا، وہ سر آج تمہارے سامنے جھکا ہے۔“

یہ کہتے ہی وہ اچانک جھکتا ہوا اس کے قدموں میں گر پڑا۔ سارہ فوراً ہی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کیا کررہے ہیں؟“

اس کا سر جیسے سجدے میں تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ بلک بلک کر کہہ رہا تھا۔ ”میری گود میں پرورش پانے والی بے حیا نہیں ہوسکتی۔ بے حیا بدمعاش میرا بیٹا ہے۔ میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔“

وہ تڑپ کر فرش پر جھک کر اس سے لپٹ گئی۔ ”انکل! اٹھ جائیں۔ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ باپ کا سر بیٹی کے قدموں میں نہیں جھکتا۔ آپ میرے پاپا جیسے ہیں۔ پلیز! اٹھ جائیں۔“

حماد اٹھ گیا اور روتے ہوئے بھتیجی کو گلے سے لگالیا۔ ایسے جذباتی لمحات میں وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھے معاف کروگی تو خدا مجھے معاف کرے گا۔ بھائی جان بھی معاف کردیں گے۔“

”میں پاپا سے کہوں گی، وہ ضرور معاف کردیں گے۔ پھر یہ کہ آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے لیکن میں جواد کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”ہاں۔ کبھی معاف نہ کرنا۔ میں بھی اس سے بات نہیں کروں گا۔ اسے اس کی ماں کے ساتھ انیکسی میں جانا چاہیے لیکن مجھے یہاں سے نکالا جائے گا تو یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوگی۔“

”کوئی آپ کو یہاں سے نہیں نکالے گا۔ چلیں.... میں ابھی پاپا سے کہتی ہوں۔“

وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے اور داؤد کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ حماد نے قسم کھائی تھی کہ بگڑی ہوئی بات بنائے بغیر وہاں سے نہیں جائے گا اور وہ بڑی چالبازی سے بگڑی بنارہا تھا۔

اگر نوٹوں کی گڈی اپنی غلطی سے گر پڑے تو اسے اٹھانے کے لیے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھتیجی کے قدموں میں جھک کر کھوئی ہوئی دولت اور جائداد حاصل کرنے والا تھا۔

داؤد اپنے بیڈ روم میں بیٹھا پی رہا تھا۔ اس نے حماد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم تینوں کو محل سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ تم ابھی تک یہیں ہو؟“

حماد نے سر جھکا کر بھائی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ سارہ نے کہا۔ ”پاپا! یہ میرے بزرگ ہیں۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ غلطی جواد نے کی ہے۔ آپ اُسے محل سے نکالیں۔“

داؤد نے سوچتی ہوئی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”بھائی جان! آپ مجھے جیسی بھی سزا دیں مگر اپنے قدموں میں رہنے دیں۔ بیٹے کی غلطی کی سزا اگر باپ کو ملتی ہے تو مجھے ضرور سزا دیں۔“

داؤد نے بیٹی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”پلیز پاپا! یہ بھی میرے باپ ہیں۔ پہلے کی طرح ان کی عزت کریں۔“

اس نے بیٹی کی بات مان لی۔ سر ہلا کر حماد سے کہا۔ ”اٹھو.... یہاں اوپر بیٹھو۔“

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان! گارڈز کو دروازہ کھولنے کا حکم دیں۔ جواد اور بلقیس انیکسی میں

جائیں گے۔"

اس نے فون اٹھا کر رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ان کے لیے دروازہ کھلوانا ہے۔"

اس نے فون پر ایک گارڈ سے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ جواد اور اس کی ماں کو انیکسی میں پہنچاؤ۔ وہاں ان کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔"

اس نے ضروری احکامات صادر کیے پھر فون بند کر دیا۔ حماد بوتل کھول کر دو گلاس بنا رہا تھا۔ سارہ کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ کوریڈور سے گزرتے ہوئے ماں کے کمرے کے پاس آ کر رک گئی۔ وسیم وہاں کے اسٹور روم میں چھپا ہوا تھا۔

اس نے سر گھما کر دور داؤد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں کا دروازہ بند تھا۔ دونوں بھائی پی رہے تھے۔ ادھر آنے والے نہیں تھے۔ وہ اندر آ کر دروازے کو لاک کر کے سیدھی اسٹور روم میں آئی۔ وسیم کسی کی آہٹ سن کر ایک الماری کے پیچھے چھپنے چلا گیا۔ اس نے آ کر خالی اسٹور روم دیکھا پھر کہا۔ "میں ہوں تمہاری سارہ... آ جاؤ۔"

اس نے باہر آ کر اسے دیکھا لیکن پیار والی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ چپ چاپ سر کو جھکا لیا۔ وہ قریب آ کر بولی۔

"کیا بات ہے؟ بہت اداس لگ رہے ہو؟"

"کیا اداس اور مایوس نہیں ہونا چاہیے؟ آخر میں کب تک چوروں کی طرح چھپتا رہوں گا؟ میرا تمہارا رشتہ چوری کا نہیں ہے۔"

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر دھڑکنوں سے لگ گئی۔ پھر بولی۔ "مجھے احساس ہے۔ تم بار بار کئی گھنٹوں تک اسٹور روم میں کھڑے رہتے ہو یا بیٹھے رہتے ہو۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بار پاپا کو اچھی طرح یقین ہو گیا ہے۔ آئندہ کوئی ہمارے کمرے میں نہیں آئے گا۔ اب تم نہیں چھپو گے۔ آرام سے بیڈ روم میں رہا کرو گے۔"

"کیا ابھی تم مجھے لینے آئی ہو؟ ہم اپنے بیڈ روم میں جا رہے ہیں؟"

"ایک آدھ گھنٹا صبر کرو۔ جب بجلی جائے گی تو میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔"

رات کو بجلی کی روشنی میں خفیہ کیمروں کے ذریعے محل کے ہر حصے کو دیکھا جاتا تھا۔ صرف ماں باپ اور بیٹی کی خواب گاہوں میں اور حرم سرا میں کیمرے نہیں تھے۔

وسیم نے پھر پوچھا۔ "میں کب تک ایک مجرم کی طرح چھپا رہوں گا؟ عقل کہتی ہے کسی نہ کسی دن پکڑا جاؤں گا۔"

"خدا نہ کرے کہ کسی کی نظروں میں آؤ۔ تم دیکھ رہے ہو میں تمہیں کیسے چھپا کر رکھتی ہوں۔ تمہاری ہوا کسی کو لگنے نہیں دیتی۔"

"یعنی ہم اسی ایک بیڈ روم میں زندگی گزارتے رہیں گے؟ وہیں ہمارے بچے ہوں گے۔"

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر کہا۔ "بچے... او گاڈ! بچوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا... تمہارا پیار میرے اندر پرورش پائے گا۔ میں اسے جنم دوں گی۔ ہائے... میں تو اسے پیار کرتے نہیں تھکوں گی۔"

وسیم اس کی مسرتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے بچے کی اہمیت کو اب وہ بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں بالکل ہی بھول گئی تھی کہ تم پیار کا اتنا بڑا خزانہ دے سکتے ہو۔ ہائے اللہ! جب وہ میرے وجود کے اندر آئے گا تو میں خوب فخر محسوس کروں گی۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ یکبارگی دماغ کو جھٹکا لگا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا، اس کا باپ اور تمام گارڈز دیکھ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ یہ پیٹ کیسے نکل آیا؟

وہ فوراً ہی وسیم سے الگ ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اگر ایسا ہوا تو پیٹ چھپاؤں گی؟"

"چوری کبھی نہ کبھی پکڑی جاتی ہے۔ تم اپنی ہیرا پھیری سے مجھے چھپائی رہو، کوئی ہمیں نہیں پکڑے گا لیکن قدرتی گرفت سے کیسے بچو گی؟"

"مجھے ڈرا رہے ہو۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "مام نے کہا تھا کہ اگر عورت زرخیز ہو اور اپنے مرد کے ساتھ سوتی رہے تو ایک یا دو ماہ بعد ہی پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ "آج ہماری تیسری رات ہے۔ اتنی جلدی تو کچھ نہیں ہوگا نا؟"

"میں کیا بولوں؟ ایسے معاملات میں کچھ نہیں جانتا۔ ویسے موٹی عقل سے بھی سوچو تو ہم ایک ہی کمرے میں، ایک ہی بیڈ پر رہیں گے۔ تمہاری مام کے کہنے کے مطابق ایک دو ماہ بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں بھی ہو سکتا۔"

"یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا اور کچھ کرنا ہوگا۔"

"کچھ کرنے کا ایک ہی راستہ ہے، یہاں سے نکل بھاگو۔"

"بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ پورے ملک میں پاپا

کے جاسوسوں سے چھپ نہیں سکیں گے۔"

وہ بولا۔ "کسی طرح سسٹر سے رابطہ ہو جائے تو وہ ہماری سلامتی کے لیے جان کی بازی لگا دیں گی۔"

"تم نے ایک بار رابطہ کیا تھا اور زبردست دھوکا کھا گئے تھے۔"

"ہاں۔ وہ تمہارے پاپا کی جاسوس تھی۔ میرا دل کہتا ہے، سسٹر مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔"

"دل کے کہنے سے ہمارا بھلا نہیں ہوگا۔ دماغ سے سوچو، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کچھ نہ کر سکے تو ایک دوسرے سے فاصلہ رکھیں گے۔ نہیں رکھیں گے تو بچہ لازمی ہوگا۔"

"تم سوچو۔ میں جا رہی ہوں۔ بجلی جائے گی تو یہاں آ کر تمہیں لے جاؤں گی۔"

وہ اسے اسٹور روم میں چھوڑ کر کمرے میں آئی۔ بے چارے کے نصیب میں لکھا تھا کہ اسٹور روم میں فاضل سامان کی طرح پڑا رہے اور خیرات کے طور پر ملنے والے ازدواجی لمحات گزارتا رہے۔

سارہ نے ماں کی الماری کھول کر ایک تصویروں کی البم نکالی۔ پہلے صفحے پر ماں کی تصویر دیکھ کر دل سے آہ نکلی۔ بے چاری بے موت ماری گئی تھی۔ قاتل باپ تھا لیکن کبھی گرفت میں آنے والا نہیں تھا۔

بیٹی کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی تو ٹھٹک گئی۔ باپ اور چچا بھی کمرے سے باہر آئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بوتل تھی، دوسرے کے ہاتھوں میں گلاس۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے پینے کے لیے ٹیرس پر جا رہے تھے۔

باپ نے پوچھا۔ "تم ماں کے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ البم کھول کر ماں کی ایک تصویر دکھائی، پھر آنسو پونچھنے لگی۔ باپ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں بھی تمہاری ماں کو مس کر رہا ہوں۔ صدمہ برداشت کرو اور کرنا ہی ہوگا۔ ہم کسی کے لیے ساری عمر آنسو نہیں بہاتے۔ صبر کرو۔"

وہ اس کے شانے پر تھپک کر بھائی کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور کوریڈور کے ایک موڑ پر گم ہو گیا۔ سارہ نے آگے بڑھ کر دیکھا، وہ دونوں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

اس نے سیڑھیوں کے قریب آ کر دیکھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ چھت پر پہنچ گئے تھے۔ ایسے ہی وقت گہری تاریکی چھا گئی۔ بجلی چلی گئی تھی۔

اس نے سوچا، ماں کے کمرے میں چارجر لائٹ ہے۔ وہ اس کی روشنی میں وسیم کو اپنے کمرے میں لے آئے گی۔ بجلی کبھی منٹوں میں آ جاتی تھی، کبھی ایک آدھ گھنٹے بعد آتی تھی۔

وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وہاں سے چارجر لائٹ لے کر اسٹور روم کا دروازہ کھول کر بولی۔ "میں ہوں سارہ۔ جلدی آؤ۔ راستہ صاف ہے۔"

وہ سامان کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا، ایک کوریڈور سے گزرتا ہوا اپنے بیڈ روم کے دروازے پر آ گیا۔ اسے کھول کر جیسے ہی اندر پہنچا تو خوف سے اچھل پڑا۔ سارہ بھی ڈر گئی۔ فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی چیختی ہوئی بلا آ گئی ہو۔

سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ "ہیلو... کون؟"

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "شاید تم مجھے آواز سے پہچان سکو۔ میں تمہیں تاریکی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہاری مام دہشت گردوں کی فائرنگ سے ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ اس رات محل میں دہشت گرد نہیں آئے تھے۔"

سارہ نے کہا۔ "آئے تھے۔ میں نے محل کے اندر مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔"

"تم نے آوازیں سنی تھیں، آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا۔ وہاں ڈراما کیا گیا تھا۔ تمہاری مام کے قاتل کو چھپانے کے لیے تمام گارڈز نے فائرنگ کر کے الماری اور دیواروں پر گولیوں کے نشان بنائے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق دہشت گردوں نے ایسا کیا تھا۔ وہ کبھی سچ نہیں بولیں گے کہ ان کے آقا نے بیگم صاحبہ کو گولی ماری تھی۔"

سارہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بے یقینی سے بولی۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پاپا نے میری مام کو قتل کیا ہے؟"

"بے شک... تم میری بات کا یقین کرو۔"

"کیسے یقین کروں؟ وہ کیوں خواہ مخواہ ان کی جان لیں گے؟"

"میں نہیں جانتا۔ تم جاننے کی کوشش کرو۔ میری بات کا یقین نہ آئے تو ایک مہربانی کرو۔ اپنے پاپا سے بھی یہ نہ کہنا کہ کسی نے ان کے خلاف تم سے سچ کہا ہے۔"

"میں ان سے کہوں گی تو کیا وہ تمہیں پہچان لیں گے؟"

"ہاں۔ وہ مجھ پر شبہ کریں گے۔"

"میں بھی تمہیں پہچان رہی ہوں۔ تم خواجہ سرا گارڈ ہو۔ تمہاری ڈیوٹی بیرونی دروازے پر ہوتی ہے۔ اندر آنے اور دروازہ کھولنے کے لیے ایک چابی تمہارے پاس رہتی ہے۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”جی ہاں۔ میرا نام شاکر ہے۔ اگر تم میرے خلاف اپنے پاپا سے بولو گی تو میری موت لازمی ہوگی۔ سوچو اتنی بڑی دنیا میں تم تنہا رہ گئی ہو۔ تمہارے سر کے باپ کے نام کی جو چھت ہے' وہ بہت کمزور ہے۔ کسی دن تم پر بھی گرے گی۔“

اس نے پوچھا۔ ”تمہیں مجھ سے ہمدردی کیوں ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ اب تو سچ بولتے بولتے مرنا ہے۔ میرا جو بھی انجام ہو' ایک سچ تمہارے باپ کے بارے میں کہہ دیا۔ دوسرا سچ یہ ہے کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ تم کیوں اچھی لگتی ہو؟ میرا دل تمہارے لیے تڑپتا رہتا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا تم خواجہ سرا نہیں ہو؟“

فون پر ایک گہری سانس یوں سنائی دی جیسے اس خسرے شاکر کے سینے سے آہ نکلی ہو۔ وسیم سارہ کے فون سے کان لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

شاکر نے کہا۔ ”ہاں۔ میں مرد ہوں مگر نہیں ہوں۔ جب دس برس کا تھا' تب ایک بہت ہی دولت مند شخص نے جبراً آپریشن کے ذریعے مجھے خسرہ بنا دیا تھا۔ مجھ سے زیادتی کرتا رہا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے۔ بڑی بے باکی سے کہتا ہوں' تمہارے باپ سے بھی نفرت ہے۔ وہ بھی کم سن لڑکوں کا مستقبل برباد کرتا رہتا ہے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”کل یہاں دوبارہ ایک بہت ہی کم سن لڑکا لایا جائے گا۔ یہ کیسی بے شرمی اور درندگی ہے؟ تمہارا باپ بہت طاقت ور ہے۔ میں اسے حیوانیت سے روک نہیں سکوں گا۔ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکوں گا۔“

وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”کئی بار سوچا' ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن تم نے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ روز تمہیں دیکھتا ہوں اور بہلتا ہوں۔ یہاں سے جا کر تمہارے دیدار سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔“

وہ بول رہا تھا۔ سارہ اور وسیم نے سر گھما کر ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر سارہ نے فون پر کہا۔ ”پیار میں ایک دوسرے کو پا لینا ضروری ہوتا ہے۔ تم کیا سوچ کر مجھ سے عشق کر رہے ہو؟“

”مجھے جبراً ایسا بنا دیا گیا ہے۔ ورنہ قدرتی طور پر آج بھی مرد ہوں لیکن خود غرض نہیں ہوں۔ تمہیں یک طرفہ پا لینے کی غلطی نہیں کروں گا۔ پچھلے چار برسوں سے یہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ دور ہی دور سے تمہاری پرستش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔“

وہ بولی۔ ”یہ سن کر مام کی موت کا صدمہ اور بڑھ گیا ہے کہ پاپا نے انہیں اٹھارہ برسوں سے سہاگن بنائے رکھنے کے بعد گولی ماری ہے۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”تمہارے معاف کرنے نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تو کبھی خدا سے بھی معافی نہیں مانگتے۔“

سارہ نے سر گھما کر وسیم کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ”میں یہاں سے دور کھلی فضاؤں میں سانسیں لینا چاہتی ہوں۔ ایک نئی زندگی گزارنا چاہتی ہوں مگر اس ملک میں جہاں جاؤں گی' وہاں پاپا کی حکمرانی ہوگی۔ میں اپنے محبوب کے ساتھ اپنی مرضی سے کہیں رہ نہیں سکوں گی۔“

اس نے پوچھا۔ ”تمہارا محبوب...؟ کیا تم کسی کو چاہتی ہو؟“

”ہاں۔ تمہیں یہ سن کر مایوسی ہوگی۔ وہ میرے دل میں رہتا ہے۔ اس وقت بھی میرے پاس ہے' میرے دل میں دھڑک رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں مایوس نہیں ہوا' خوش ہوں۔ تم جسے بھی چاہو گی' میں اس کا رقیب نہیں بنوں گا۔ ابھی کہہ چکا ہوں' تمہیں پا لینے کی یک طرفہ غلطی نہیں کروں گا۔ تمہیں کسی مکمل مرد کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔ ہم قدرتی تقاضوں سے انکار نہیں کریں گے۔ تم کسی نہ کسی سے شادی کرو گی۔ بچوں کی ماں بنو گی' ایک بھرپور زندگی گزارو گی۔ لیکن میں تمہارے قریب رہ کر دور ہی دور سے تمہاری پرستش کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں اس محل سے نکل کر اپنے محبوب کے ساتھ تنہا زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ کیا سچ کہہ رہے ہو کہ حسد اور رقابت میں مبتلا نہیں رہو گے؟“

”کبھی نہیں۔ میں قدرتی تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہاری ازدواجی زندگی کی خوشیاں دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔ لیکن تمہارا محبوب کون ہے؟ تم اس محل سے باہر کیسے جاؤ گی؟ کیا اپنے باپ کی مرضی اور مزاج کے خلاف اس کے ساتھ کہیں رہ سکو گی؟“

”یہی تو مشکل ہے۔ وہ ہم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری خوشیاں چاہتے ہو تو کوئی راستہ دکھاؤ۔ میرے لیے کچھ کرو۔“

”بہت مشکل ہے لیکن میں سوچتا ہوں۔ تمہاری خوشیوں کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔ کیا ایک آدھ گھنٹے بعد فون کر سکتا ہوں؟“

”ہاں۔ کچھ سوچو' کچھ کرو۔ پاپا اور انکل میرس پر ہیں۔ جب وہ نیچے آ کر سو جائیں گے' تب میں خود تمہیں کال کروں گی۔“

اس نے بٹن دبا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پلٹ کر وسیم کے سینے سے لگ گئی اور اس سے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟ میں بعد میں اس گارڈ سے کیا بات کروں گی؟“

”ابھی تو ہمیں یہ سوچنا سمجھنا ہے کہ وہ ہمارے کسی کام آئے گا یا نہیں؟ وہ تمہارا دیوانہ ہے۔ میں تمہارے کسی عاشق دیوانے کو برداشت نہیں کروں گا۔“

”پلیز! رقابت سے نہ سوچو۔ وہ میرے پاس آ کر بھی بے ضرر رہے گا۔ تم اس کی مجبوری سمجھتے ہو اس لیے اپنے مطلب کی بات سوچو۔ ہم اسے دوست بنائیں گے تو وہ تمہیں اس محل سے بخیریت نکال سکے گا۔ میرے اور تمہارے لیے کہیں چھپ کر رہنے کی جگہ بنا سکے گا۔“

”کیا یہاں سے جا کر بھی ہم چھپتے رہیں گے؟“

”ہو سکتا ہے' ہمیں اس ملک سے باہر جا کر کہیں پناہ مل جائے۔ وہاں ہمیں چھپ کر نہیں رہنا پڑے گا۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سارہ نے کہا۔ ”اس پہلو سے سوچو' اسے راز دار بنا کر ہم اس قید خانے سے نکل سکیں گے یا نہیں؟“

”یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم میری خاطر اس محل کو قید خانہ کہہ رہی ہو۔ یہاں کا عیش و آرام' دولت اور جائداد چھوڑ دینا چاہتی ہو۔“

”میں جب سے پیدا ہوئی ہوں' مام کے ساتھ یہاں قیدی بن کر رہتی آئی ہوں۔ پاپا نے اسے گناہوں کا محل بنا رکھا ہے۔ کل ایک کم سن لڑکا یہاں آنے والا ہے۔ سوچتی ہوں تو شرم سے مرنے لگتی ہوں۔“

”مجھے تو غصہ آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے' تمہارے پاپا کو ہی ختم کر دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری...“

”پلیز! ایسا نہ کہو۔ پاپا نے ظلم کی انتہا کی ہے۔ میری مام کو ہلاک کیا ہے۔ مجھے اُن سے نفرت ہے۔ پھر بھی انہیں زندہ رہنا چاہیے۔ جیسے بھی ہیں' ایک سہارا تو ہے کہ میرے باپ ہیں۔ چھتا ہوا محل ہیں مگر حیا کے طور پر سر ڈھانپ رہے ہیں۔ وہ مجھے غیروں کی دشمنی سے اور اپنوں کے مکر و فریب سے بچائے رکھتے ہیں۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ”ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کل یہاں ایک کم سن چھوکرا آئے گا اور میرے پاپا بہت ہی بدکار ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم یہاں کب تک چھپ کر رہو گے؟ ایک اور مسئلے پر بھی دھیان گیا ہے کہ میں ماں بن سکتی ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم ایک چھت کے نیچے ایک دوسرے سے دور رہ سکیں گے؟“

”کبھی نہیں رہ سکیں گے۔“

”تو ہمیں آزادی سے ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔“

”میں تو دل سے یہی چاہتا ہوں مگر یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے؟ میرا اور سسٹر کا مکان دشمنوں کی نظروں میں رہتا ہوگا۔ میں اُدھر کا رخ نہیں کر سکوں گا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے' وہاں تمہارے باپ کی حکمرانی ہوگی۔“

”بس ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے... ہم سرحد پار کر کے کسی بھی پڑوسی ملک میں آزادی سے رہ سکیں گے۔“

وسیم نے کہا۔ ”پھر تو یہاں سے نکلنے کے لیے وہ خسرہ گارڈ شاکر ہی ہمارے کام آ سکے گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں' اسے رقیب مت سمجھو۔ کیا میں ایسی نادان ہوں کہ ایک ملازم کو منہ لگاؤں گی؟ اسے میرا دیوانہ بن کر رہنے دو۔ اس کی دیوانگی ہماری نجات کا ذریعہ بنے گی۔“

وہ بیڈ پر آ گئے تھے۔ دھیمی سرگوشی میں بول رہے تھے۔ سارہ نے کہا۔ ”ہمیں سرگوشی کے لیے اسی طرح لگ کر رہنا ہوگا جبکہ ہمیں فاصلہ رکھنا چاہیے۔ بچے والی بات نے مجھے سہما دیا ہے۔“

”ہاں۔ ہمارے عجیب حالات ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے قریب ہو کر اپنے آپ سے دشمنی کریں گے۔“

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا ہم ایک ہی بستر پر رہ کر دریا کے دو کنارے بن سکیں گے؟“

وہ بولا۔ ”مشکل ہے۔ ہم بہک جائیں گے۔“

”ہمیں سنبھلنا ہوگا۔ ورنہ قدرتی طور پر بھید کھلے گا تو کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ ہم دونوں بے موت مارے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اسٹور روم میں جا کر سو جاؤں گا۔“

”تم وہاں فرش پر کاٹھ کباڑ میں رہو گے تو کیا مجھے نیند آئے گی؟ ہرگز نہیں۔ تم اسی بیڈ پر رہو گے۔ میں باہر سے دروازہ بند کر کے مام کے کمرے میں رات گزاروں گی۔ پھر صبح آ جاؤں گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”نہیں گڑبڑ ہو جائے گی۔ تمہاری غیر موجودگی میں کوئی اُدھر آ سکتا ہے۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔ پاپا پوری طرح مطمئن ہو گئے ہیں... کوئی اُدھر کا رخ نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہ دروازہ باہر سے مقفل رہے گا۔ تم میری آواز سنے بغیر اسے نہیں کھولو گے۔ اطمینان رکھو' اب کسی کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہوگا۔“

رات کا ایک بجا تھا۔ وہ دونوں بھائی ٹیرس پر بیٹھے پی رہے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ حماد نے کہا۔ ''بھائی جان! یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ آج نہیں تو کل جواد کو معاف کردیں گے۔ آپ اسے بہت چاہتے ہیں۔ اسی کو داماد بنائیں گے۔''

داؤد نے ناگواری سے کہا۔ ''ابھی اُس کا نام نہ لو۔ دوسری باتیں کرو۔''

''سوری... اب اس کی کوئی بات نہیں کروں گا۔ آپ کی باتیں کرتا ہوں۔ یہ بتائیں' بھابھی تو اللہ کو پیاری ہوگئیں' کیا دوسری لائیں گے؟''

وہ انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بیوی نام کی چیز پالنے کی حماقت کیوں کی جائے؟ جبکہ ہر رات ایک نئی عورت ایک نئے روپ میں نئی اداؤں کے ساتھ مل جاتی ہے۔''

اس نے گلاس خالی کرکے میز پر رکھا۔ پھر بڑے فخر سے کہا۔ ''میری کوئی رات خالی نہیں جاتی۔ آج تم لوگوں کی وجہ سے بیگ ہونے والے داماد کا خیال کرتے ہوئے میں نے حرم سرا کو ویران رکھا ہے۔ کل اسے اور بلقیس کو یہاں سے لے جاؤ۔''

''ضرور لے جاؤں گا۔ کیا چالیسویں کے بعد آؤں؟''

وہ دوسرا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ بیگم نہیں رہی۔ پورے محل میں ایک جوان بیٹی تنہا رہ گئی ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں چاہوں گا' بارات لاؤ اور اسے لے جاؤ۔''

اسی وقت لائٹ آگئی۔ حماد نے کہا۔ ''آپ کی زبان مبارک ہے۔ بیٹی کو دلہن بنانے کی بات کرتے ہی روشنی ہوگئی۔''

وہ غٹاغٹ پی رہا تھا۔ پھر اس نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس اب سونا چاہیے۔ میں گارڈ سے کہتا ہوں' وہ دروازہ کھول دے گا۔ تم انیکسی میں چلے جاؤ۔''

وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ داؤد نے بہت پی لی تھی۔ حماد اسے سہارا دے کر نیچے لے آیا۔ اس نے اپنے بیڈ روم کے دروازے پر آکر فون کے ذریعے گارڈ سے کہا۔ ''شاکر! دروازہ کھولو۔ میرا بھائی انیکسی میں جائے گا۔''

''آل رائٹ سر! میں دروازہ کھول رہا ہوں۔''

داؤد نے کمرے میں جاکر بھائی کو لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں شب بخیر کہا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ سارہ رات گزارنے کے لیے ماں کے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔ اس نے بیرونی دروازے کو کھلتے ہوئے دیکھا تو رک گئی۔ شاکر اسے دیکھ کر ایک تابع دار کی طرح الرٹ ہوگیا۔

اب اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ وہ محض ایک تابع دار محافظ نہیں ہے' ایک عاشق بھی ہے۔ اس پر ہزار جان سے قربان ہورہا ہے۔

سارہ نے پہلی بار اسے توجہ سے دیکھا۔ وہ دراز قد' صحت مند گبرو جوان تھا۔ چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اسی قدر در پردہ... کھوکھلا بھی تھا۔

حماد نے آکر پوچھا۔ ''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''مام کے کمرے میں سونے جارہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے... جاؤ! آرام کرو۔''

وہ بولتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔ شاکر نے سارہ کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ یہ جانتا تھا کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے وہ دونوں دیکھے جارہے ہیں۔ اس نے فوراً ہی دروازے کو باہر سے بند کرلیا۔

سارہ ماں کے کمرے میں آگئی۔ ماں کا خالی بستر اور وہاں کا تمام سامان دیکھ کر شاکر کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا' یہاں کے تمام گارڈز بھی سچ نہیں بولیں گے کہ ان کے آقا نے بیگم صاحبہ کو گولی ماری تھی۔

بیٹی کے دل سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ''آہ مام! میں آپ کے لیے کیا کروں؟ کس سے انصاف مانگوں؟ یہاں تو منصف ہی قاتل ہے۔ میرا باپ ہے۔ میں انصاف نہیں لے سکوں گی۔ آپ کا فیصلہ خدا پر چھوڑتی ہوں۔ خدا کرے پاپا کو عبرت ناک سبق حاصل ہو۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے بڑے دکھ سے ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر لائٹ چلی گئی۔ وہ ماں کے کمرے سے جو چارجر لائٹ لے گئی تھی' اسے پھر واپس لے آئی تھی۔ اس نے روشنی میں وقت دیکھا' دو بج گئے تھے۔

اسے سوجانا چاہیے تھا لیکن مسائل جگا رہے تھے۔ اس کے اور وسیم کے درمیان شاکر آگیا تھا۔ اسے کباب میں ہڈی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ ان کے بہت کام آسکتا تھا۔ وسیم کو بخیریت اس محل سے باہر پہنچا سکتا تھا۔ اسے آزادی ملتی' تحفظ حاصل ہوتا اور کہیں نہ کہیں پناہ مل جاتی۔

وہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وسیم کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ محل چھوڑے گی تو باہر کہاں بھٹکتی رہے گی؟ مال و زر کی کمی نہیں تھی۔ اس کی الماری میں لاکھوں ڈالرز کے علاوہ زیورات اور کچھ جواہرات بھی تھے۔ لیکن یہ سب کچھ لے کر وہ کہاں جائے گی؟ آگے راستہ تاریک تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی۔

اس کا اور وسیم کا ذہن کام نہیں کررہا تھا۔ اب تیسرا آگیا تھا۔ شاید وہ سلامتی کا کوئی راستہ دکھا سکتا تھا۔ ایسے وقت یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ کیا وسیم کے سلسلے میں شاکر کو راز دار بنانا ہوگا؟

آزادی سے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے کسی بھی مددگار پر بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ شاکر پر اعتماد کیے بغیر وسیم کو بخیریت محل سے نکالا نہیں جاسکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے فون کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ''شکریہ... تم وعدے کے مطابق فون کررہی ہو۔ میں بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے پیار کی' اپنی دیوانگی کی باتیں نہ کرو۔ میرے لیے کچھ کرو۔''

''تمہارے لیے تو جان بھی دے دوں گا۔ بولو کیا کروں؟''

''میں اس محل سے نکل کر اپنے محبوب کے ساتھ ایک گھریلو ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''کیا تمہارا وہ محبوب کسی خفیہ پناہ گاہ میں تمہاری حفاظت کرسکے گا؟''

''وہ بھی بے گھر' بے در اور بے یار و مددگار ہے۔''

''پھر تو اس ملک میں کہیں بھی چھپ کر رہو گے تو کسی نہ کسی دن پکڑے جاؤ گے۔''

''کیا تم ہمیں سرحد پار کراسکو گے؟ ہم اُردن' شام یا ترکی کہیں بھی چلے جائیں گے۔''

''میں ایک معمولی سیکیورٹی گارڈ ہوں۔ سرحدی چوکیوں تک میری پہنچ نہیں ہے۔ پھر بھی تمہارے کام آنے کے لیے کوئی تدبیر ضرور کروں گا۔''

''کیا تم مجھے یا کسی کو بھی اس محل کے باہر پہنچا سکتے ہو؟''

''ہاں! یہ میرے لیے آسان ہے... لیکن تم یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گی؟ اگر مجھ سے راضی ہوجاؤ تو کل ہی کوئی خفیہ پناہ گاہ تلاش کروں گا۔ کل رات اسی وقت تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے وسیم کے متعلق کیسے بتائے اور صرف بتانا ہی نہیں تھا' اسے اعتماد میں بھی لینا تھا... اور یہ سب کچھ فون کے ذریعے نہیں ہوسکتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن بہت ساری باتیں ہیں۔ فون پر نہیں ہوسکیں گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا میں آجاؤں؟ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ کوئی بھی گارڈ ہمیں اسکرین پر نہیں دیکھ سکے گا۔''

''پھر اچانک لائٹ آئے گی تو ہم دیکھ لیے جائیں گے۔''

''میں اندر آکر دروازے کے پاس ہی رہوں گا۔ لائٹ آئے گی تو ٹی وی اور کیمروں کو آن ہونے میں جتنا وقت لگے گا اتنی دیر میں باہر جاکر دروازہ بند کردوں گا۔ صرف تم تنہا دکھائی دو گی۔ کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔ پوچھ گچھ نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دروازے کے پاس آرہی ہوں۔''

وہ انتظار کرنے لگا۔ فون آن تھا۔ تھوڑی دیر بعد آواز سنائی دی۔ ''میں آگئی ہوں۔''

وہ فون بند کرکے دروازے کو آہستگی سے کھول کر اندر آگیا۔ وہاں گہری تاریکی نہیں تھی۔ باہر چاندنی روشنی تھی جس کے سبب وہ دونوں سائے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ان لمحات میں سارہ کو شاکر کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہ خیال آیا کہ اس کا دیوانہ وسیم کی طرح ایک نوجوان لڑکا نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک قد آور پہاڑ جیسا مرد ہے۔ وہ پہلی بار تنہائی میں ایک چٹان جیسے مرد کے قریب آئی تھی۔

وہ دھیمی دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''تم مجھ سے وہ باتیں کہنے آئی ہو جو فون پر نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ایسی کیا بات ہے' جلدی بولو! لائٹ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔''

''کیا تم میرے محبوب کو رقیب سمجھو گے؟ کیا اس سے دشمنی کرو گے؟''

''کبھی نہیں۔ تم جس کے ساتھ رہو گی، میں تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔''

''کیا میں تم پر بھروسا کروں کہ میرے راز دار بن کر رہو گے؟ میرا ایک اہم راز ہے۔ اسے کسی کے سامنے زبان پر نہیں لاؤ گے؟''

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں۔ تمہارا راز ہمیشہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا' کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''وہ وسیم جو دیمہ بن کر یہاں آیا تھا... وہی میرا محبوب' میرا مجازی خدا ہے۔''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ نکاح پڑھائے بغیر وہ تمہارا مجازی خدا کیسے بن سکتا ہے؟''

''ہم نے مام کی موجودگی میں خدا کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔''

وہ مزید حیرانی سے بولا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وسیم یہاں اسی محل میں موجود ہے؟''

''ہاں۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے۔ میں اسے چھپا کر رکھتی ہوں۔''

اس نے بڑے دکھ سے ان تصویروں کو دیکھا۔ اسے وسیم سے وسیمہ بنا دیا گیا تھا۔ یاقوت اس کے لیے پریشان تھی۔ کانونٹ سے نکلنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ ”کسی طرح اسے تلاش کرو۔ وہ زندہ ہے۔ کہیں مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔“

حارث نے دل ہی دل میں کہا۔ ”بے چاری یاقوت سوچ بھی نہیں سکے گی کہ وسیم انتہائی شرمناک مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔“

اس نے ایک زخمی کارندے کو وسیم کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ لڑکا کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”اسے تو بہت بڑے آدمی کے پاس پہنچایا گیا ہے۔ یہ داؤد اسرار کے محل میں ہے۔“

”کب سے وہاں ہے؟“

”ابھی چار دن ہوئے ہیں۔ تم فون کر کے معلوم کر سکتے ہو۔“

وہاں ٹیلی فون ڈائریکٹری میں داؤد اسرار کے گھر اور دفاتر کے فون نمبرز تھے۔ اس نے تمام نمبر اپنے فون میں محفوظ کیے پھر اس سے رابطہ کیا۔ دفتر سے کہا گیا کہ وہ گھر میں ہے۔

اس نے گھر کے نمبر پر رابطہ کیا مگر کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ داؤد نے رات کو خوب پی لی تھی۔ اس وقت نیند میں مست تھا۔ اس کے ذاتی موبائل فون کی کالنگ ٹون بھی چیختے رہنے کے بعد چپ ہو گئی تھی۔

حارث نے سوچا بعد میں پھر ان نمبرز پر رابطہ کرے گا۔ اپنے ہی عراقی بھائی بہنوں اور ماؤں پر مظالم ڈھانے والے حکمرانوں میں داؤد اسرار سرِفہرست تھا۔ کئی گروپوں کے مجاہدین اس کی تاک میں رہتے تھے۔ ایک آدھ بار اس پر حملے کیے گئے لیکن وہ انتہائی سخت سیکیورٹی کے باعث محفوظ رہا۔ اب وسیم کے معاملے میں وہ اور زیادہ توجہ کا مرکز بننے والا تھا۔ حارث نے طے کر لیا کہ جلد ہی اس پر ایک منظم حملہ کرے گا۔

اس نے اپنی موجودہ پناہ گاہ میں آ کر یاقوت سے کہا۔ ”وسیم کا سراغ مل گیا ہے۔ میں ابھی فون کے ذریعے تصدیق کروں گا کہ وہ داؤد کے محل میں ہے یا نہیں؟“

یاقوت نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہو۔ فوراً فون کرو، تصدیق کرو۔“

وہ اس کے شانے کو تھپک کر بولا۔ ”ابھی کرتا ہوں۔ ذرا صبر کرو اور اس کے متعلق ایک تلخ حقیقت سنو۔“

اس نے جیب سے وسیم کی دو تصویریں نکال کر دکھائیں۔ اس نے تصویریں دیکھ کر بڑی حیرانی اور پریشانی سے وسیمہ کے روپ میں اسے دیکھا۔ حارث نے کہا۔ ”وسیم شرمناک دھندا کرنے والوں کے شکنجے میں آ گیا ہے۔“

یاقوت کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”اس معصوم لڑکے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسے کسی طرح ان کے شکنجے سے نکالو۔“

”میں نے ابوولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اس کے کئی آدمیوں کو بھی جہنم رسید کیا ہے۔ باقی فرار ہو گئے ہیں۔ اب وہاں دھندا جاری رکھنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔“

اس نے موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ”دو گھنٹے پہلے فون کیا تھا، کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔ اب تو داؤد کو ضرور بولنا چاہیے۔“

اس نے فون کو کان سے لگایا اور یاقوت کو اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ وہ چپ چاپ فون کی طرف دیکھنے لگی۔

دوسری طرف داؤد اور حماد ناشتے کی میز پر تھے۔ سارہ ان کے لیے چائے کی ٹرے لا کر رکھ رہی تھی۔ اسی وقت داؤد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو... کون ہے؟“

حارث نے پوچھا۔ ”وسیم کہاں ہے؟“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”رانگ نمبر... یہاں کوئی وسیم نہیں رہتا۔“

سارہ نے چونک کر فون کو دیکھا۔ اُدھر سے حارث نے کہا۔ ”میں اُس وسیم کا پوچھ رہا ہوں جسے وسیمہ بنا کر تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔“

داؤد نے ناگواری سے ریسیور رکھ دیا۔ حماد نے کہا۔ ”بھائی جان! ایروں غیروں کے فون اٹینڈ کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ یہاں ایک لیڈی سیکریٹری رکھ لیں۔“

سارہ نے کہا۔ ”انکل! آپ ایک سیکریٹری کے بجائے کسی عورت کو لانے کا مشورہ نہ دیں۔ آپ کی فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔“

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ بلقیس اور جواد انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے جانا چاہیے۔“

داؤد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بھائی کو گلے لگا کر رخصت کرنے لگا۔ سارہ کا دل ٹیلی فون کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ وہاں سے کسی نے وسیم کا نام لیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً اس کا شناسا تھا۔ اسے تلاش کرتے ہوئے داؤد محل کے ٹیلی فون تک پہنچ چکا تھا۔

وہ دعا مانگنے لگی کہ وہ دوبارہ کال کرے۔ اپنا نام اور اپنی پہچان بتائے۔ حماد وہاں سے جا چکا تھا۔ اس بار داؤد کا موبائل فون بولنے لگا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔

حارث نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم بارود کے ڈھیر پر

”یا خدا! ہم نے محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آیا؟“

”یہ بتانے کا وقت نہیں ہے کہ اسے کیسے چھپاتی آ رہی ہوں؟ تم بولو! کیا ہم دونوں کو یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا سکتے ہو؟“

”میں کل رات ہی ایسا کر سکتا ہوں لیکن جہاں بھی پہنچاؤں گا، وہاں بھی تم نہ کبھی چھپا پڑے گا۔ ہمیں اس مسئلے پر اچھی طرح سوچنا سمجھنا ہوگا۔ کیا وسیم تمہارے کمرے میں ہے؟“

”ہاں۔ فی الحال خطرہ ٹل گیا ہے۔ کوئی اسے تلاش نہیں کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ میں اسے کب تک چھپا کر رکھ سکوں گی؟ یہاں سے نکل کر اس کے ساتھ آزادی سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔“

”تمہاری یہ خواہش پوری ہوگی لیکن ذرا صبر کرنا اور سوچنا سمجھنا ہوگا۔“

شاکر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”پلیز! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔“

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ تمہیں دن رات دیکھنے کے لیے یہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ آئندہ تمہارے بہت کام آنے والا ہوں۔ کیا میرے کام کا صلہ پیار سے نہیں دو گی؟“

”میرا یہ جو صرف وسیم کے لیے ہے۔“

”میں وسیم سے بھی تمہیں چھیننا نہیں چاہوں گا مگر اپنے حصے کا پیار چاہتا ہوں۔ پہلے تو محض ایک عاشق تھا، اب تمہارا رازدار بھی ہوں۔“

اس نے سارہ کے گداز بازوؤں کو جکڑ لیا پھر پوچھا۔ ”کیا تم نہیں چاہتیں کہ یہ راز میرے اندر سے باہر نہ نکلے؟“

یہ کہہ کر اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں لیا، سینے سے لگایا۔ پھر اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اسے لیتا ہوا فرش پر آ گیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوششیں کرتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑو مجھے... دور سے بات کرو۔ میں رازداری کے لیے مہنگا سودا نہیں کروں گی۔ تم سے منت کرتی ہوں، التجا کرتی ہوں، ایک اچھے انسان کی طرح میرے کام آؤ۔“

وہ اپنی ایک بہت بڑی کمزوری کے ساتھ اس کے ہاتھ آئی تھی۔ اب چھڑ چھڑاتی رہتی، منتیں کرتی رہتی مگر ہارتی بھی رہتی۔ مجبور تھی۔ اس کے خلاف کسی سے کچھ بول نہیں سکتی تھی۔

وہ بھوکا شیر تھا۔ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری شادی خانہ آبادی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اپنا حصہ وصول کرنا ہے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ وسیم کے ساتھ یہاں سے جانے دوں گا۔ جہاں جاؤ گی، وہاں تمہاری سلامتی کے لیے بہت کچھ کرتا رہوں گا۔“

وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کا رازدار رہے گا۔ وہ اس کی ذات سے فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ فی الوقت تو وہ فائدہ اٹھا رہا تھا۔ سارہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پر بھروسا کر کے بری طرح پھنسے گی۔ اس کے آگے مجبور اور بے بس ہو جائے گی۔

حالات بھی اچانک یوں بدلتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ سارہ نے حیرانی سے دیکھا۔ حالات یک لخت بدل گئے۔ وہ جیسے جھنجلا کر قالین پر ہاتھ مارتا ہوا اس سے الگ ہو گیا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا؟ وہ مریض کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے سجدے کے انداز میں جھک رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر لباس درست کرتی ہوئی اس سے دور ہو گئی۔

اس کی بھاری بھاری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سایہ جو سجدے کی حالت میں کراہ رہا تھا، اب چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ پھر اسے کھول کر باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بھول گئی تھی۔ اس لیے سمجھ نہ سکی کہ پنجے مارنے والا شیر اچانک دُم دبا کر کیوں چلا گیا ہے؟

وہ باہر آ کر اوندھے منہ گر گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ المیہ یہ تھا کہ وہ ساری زندگی ٹھیک ایسے ہی وقت روتا رہے گا جب... دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہے گا۔

☆☆☆

وہ عیدالضحیٰ کی صبح تھی۔ ساری دنیا کے مسلمان نمازِ عید ادا کرنے کے بعد جانوروں کی قربانیاں دینے والے تھے۔ اس سے پہلے صدام حسین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ عوام کی جانب سے اس کی موت پر کوئی قابلِ ذکر ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایک آمر کی موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کوئی اسے شہید نہیں کہتا۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف نفرتیں معمول کے مطابق تھیں۔ مختلف شہروں خصوصاً بغداد میں اسٹریٹ فائٹنگ اور بم دھماکے ہو رہے تھے۔ حارث نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس علاقے میں گھس کر حملہ کیا تھا جہاں ابوولاد کا صدر دفتر اور فحاشی کا اڈا تھا۔ اس اِن کاؤنٹر کے نتیجے میں ابوولاد مارا گیا۔ اس کے کئی آدمی زخمی ہوئے اور باقی فرار ہو گئے۔ حارث نے کم سن لڑکوں کو وہاں کے قید خانے سے رہائی دلائی۔ اس کے آفس میں نوعمر لڑکوں کا جو تحریری اور تصویری ریکارڈ تھا، انہیں دیکھا اور پڑھا۔ ایسے وقت وسیم کی تصویریں اس کے سامنے آ گئیں۔

بیٹھے ہو۔ فون بند کرو گے تو ایک گھنٹے کے اندر ایک میزائل تمہارے محل میں آ گرے گا۔“

داؤد نے غرانے کے انداز میں کہا۔ ”ہم جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ ہمیں دھمکی نہ دو۔ کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟“

”بہت معمولی سا مطالبہ ہے۔ وسیم کو ہمارے حوالے کر دو۔“

وہ ناگواری سے بولا۔ ”تم جس وسیم کی بات کر رہے ہو وہ آج سے چار دن پہلے آیا تھا لیکن اسی دن یہاں سے فرار ہو گیا۔“

”جھوٹ مت بولو۔ بے شک تم اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہو مگر محل میں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ ان کی سلامتی کی فکر کرو اور سچ بولو۔“

اس نے سوچتے ہوئے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ ”یہاں میری ایک بیٹی ہے۔ میں اس کی سلامتی چاہتا ہوں۔ تم بہت بڑے احمق ہو۔ اگر یہ کہتے ہو کہ میں نے وسیم کو یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے تو کیا سوچ کر میزائل داغنے کی بات کر رہے ہو؟ عقل سے سوچو! ہمارے ساتھ وہ لڑکا بھی مارا جائے گا۔“

حارث نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے وسیم وہاں موجود ہے؟“

”یہی سمجھو گے تو میرے محل کو ٹارگٹ بنانے کی حماقت نہیں کرو گے۔ یاد رکھو... میں اسے یہیں قید رکھوں گا اور بیٹی کو لے کر ایک چور راستے سے نکل جاؤں گا۔ تم ہماری نگرانی کرنے والے جتنے بھی ہو ہمیں دیکھ نہیں پاؤ گے۔“

”کیا تمہارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایک لڑکے کی خاطر ہم سے دشمنی نہ کرو۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔“

”میں کس زبان میں سمجھاؤں وہ یہاں نہیں ہے۔ ہوتا تو ابھی اسے محل سے باہر بھگا دیتا۔ وہ بہت چالباز ہے۔ مجھے اور میرے مسلح گارڈز کو دھوکا دے کر نہ جانے کیسے فرار ہو گیا ہے؟ بہتر یہی ہے کہ تم اسے میرا قیدی سمجھو اور یہاں حملہ کرنے کی حماقت نہ کرو۔“

اس نے فون بند کر دیا پھر ناگواری سے چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ لیا مگر کچھ اور جھنجلا گیا۔ ”لعنت ہے... اس مردود کی بکواس میں چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ وہاں گرم چائے لے آؤ۔“

وہ میز پر بکھرے ہوئے اخبارات اٹھا کر بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا' سارہ نے فوراً ہی ٹیلی فون کی اسکرین پر حالیہ کال کرنے والے کے نمبرز پڑھے۔ پھر انہیں اپنے فون میں سیو کرنے کے بعد کیتلی سے ایک پیالی میں گرم چائے انڈیلنے لگی۔

ادھر یاقوت نے کہا۔ ”ہم کیسے یقین کر لیں کہ وسیم اس محل میں نہیں ہے... وہاں سے فرار ہو گیا ہے؟“

حارث نے کہا۔ ”یہی میں سوچ رہا ہوں۔ وسیم سمجھ دار ہے مگر چالاک نہیں ہے۔ وہ مسلح گارڈز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار نہیں ہو سکے گا۔“

”میرا دل اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ' تم کیا کرو گے؟“

”فی الحال صبر کروں گا۔ تم بھی کرو۔ ہم داؤد محل کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔ پھر اسے وہاں سے نکال لانے کی ٹھوس پلاننگ کریں گے۔“

وہ مایوس ہو کر سر جھکا کر سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ حارث نے نمبر پڑھ کر کہا۔ ”کوئی نیا نمبر ہے۔ پتا نہیں کون کال کر رہا ہے۔“

اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہیلو... فرمایئے؟“

سارہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ابھی آپ نے ہی فون کیا تھا اور وسیم کا مطالبہ کیا تھا؟“

”ہاں۔ تم کون ہو؟ کیا ہمیں وسیم کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟“

”بتا سکتی ہوں۔ پہلے یہ بتائیں' آپ کون ہیں؟“

”میں نے ابو واداور اس کے آدمیوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ جبراً استعمال کیے جانے والے لڑکوں کو شرمناک دھندے سے نجات دلا رہا ہوں۔ وسیم کو بھی اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔“

”وسیم اپنے گھر جائے گا تو پھر پکڑا جائے گا۔ اگر آپ اس کے کام آنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک سسٹر کو تلاش کریں۔ وہ آرمی اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔“

”اور اس کا نام یاقوت ہے۔“

وہ جلدی سے بولی۔ ”ہاں۔ یہی نام ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں' وہ کہاں ہوں گی؟“

”وہ یہیں ہے' لو اس سے بات کرو۔“

پھر سارہ نے ایک نسوانی آواز سنی۔ ”ہیلو... میں یاقوت بول رہی ہوں۔“

سارہ نے بے یقینی سے کہا۔ ”خوب! میں نے ابھی یاقوت کے متعلق دریافت کیا اور تم ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ظاہر ہو گئیں۔“

”کیا تم یقین نہیں کر رہی ہو؟“

”کیسے کروں؟ پہلے ایک بار ایک جاسوس نے یاقوت بن کر دھوکا دینا چاہا تھا مگر وسیم بہت چالاک ہے۔ اس نے اپنی سسٹر کے بارے میں ایسے سوالات کیے کہ اس جاسوس کا

جھوٹ پکڑا گیا۔“

”وسیم کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔ وہ میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لے گا۔ اپنی سسٹر کے بارے میں جو پوچھے گا اس کا جواب دوں گی۔ یقین کرو میں ہی اس کی سسٹر ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔ انتظار کرو۔ ذرا دیر لگے گی مگر وہ دوسرے فون سے بولے گا۔“

سارہ اپنی مرحومہ ماں کے کمرے میں تھی۔ وہاں سے نکل کر اپنے کمرے کے دروازے پر آ گئی۔ وہاں اس نے ہلکی سی دستک دی پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں ہوں سارہ۔ دروازہ کھولو۔“

دروازہ کھل گیا۔ وسیم نے پوچھا۔ ”خیریت ہے؟“

”ہاں۔ ایک خوش خبری ہے۔ اگر وہ عورت فراڈ نہ ہوئی تو تم ابھی اپنی سسٹر سے بات کرو گے۔“

وہ حیرت اور مسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ فون کی نمبر بدل رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”اس نمبر کے ذریعے تم نے ایک فراڈ یاقوت سے باتیں کی تھیں۔ اس بار بھی اچھی طرح پرکھنے کے بعد اسے سسٹر تسلیم کرنا۔“

اس نے نمبر پنچ کرنے کے بعد اسے وسیم کی طرف بڑھایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو وسیم! کیا تم نے کال کی ہے؟ میں تمہاری سسٹر بول رہی ہوں۔“

وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بڑے جذبے سے بولتا ہوا باتھ روم میں آ گیا۔ ”سسٹر! میری جان سسٹر! میں تمہاری آواز لاکھوں میں پہچان لیتا ہوں۔ تم ہی میری سسٹر ہو۔“

سارہ نے فون پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”فوراً تسلیم نہ کرو۔ اس سے سوالات کرو۔“

اس نے ہاتھ ہٹا دیا۔ ادھر سے یاقوت کہہ رہی تھی۔ ”وسیم! تم کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ کیا داؤد نے تمہیں کہیں قیدی بنا کر رکھا ہے؟“

”نہیں' میں آزاد ہوں۔ اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ پہلے مجھے اچھی طرح یقین کرنے دو۔ یہ بتاؤ کہ ہم ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت آخری بار کہاں تھے؟ اور کس طرح ایک مکان سے فرار ہوئے تھے؟“

یاقوت نے تفصیل سے بتایا کہ اس رات اس کے گھر میں ڈکیتی اور قتل کی واردات ہوئی تھی۔ وہ اور وسیم احاطے کی دیوار پھاند کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔

وسیم نے سارہ سے کہا۔ ”یہ میری اور اپنی ایک ایک بات بیان کر رہی ہیں۔ میں دیکھے بغیر پورے یقین سے کہتا ہوں' یہی میری سسٹر ہیں۔“

یاقوت نے پوچھا۔ ”تمہیں ملانے والی لڑکی کون ہے؟“

”داؤد اسرار کی بیٹی ہے۔ باپ سمجھ رہا ہے' میں یہاں سے فرار ہو گیا ہوں جبکہ اس محل سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ اس کی بیٹی سارہ نے مجھے چھپا کر رکھا ہے۔ کیا آپ ہم دونوں کو یہاں سے نکال کر لے جا سکتی ہیں؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا سارہ بھی تمہارے ساتھ آئے گی؟“

”ہاں۔ یہ میرے ساتھ رہے گی۔ یہ میری شریکِ حیات ہے۔“

”کیا...؟“ یاقوت نے حیرت سے چیخ کر پوچھا۔ ”ایک بار پھر کہو... ابھی تم نے کیا کہا ہے؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ سارہ کی ماں وکیل تھیں۔ خدا ہمارا گواہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے نکاح قبول کیا ہے۔“

یاقوت نے خوشی سے حارث کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ”سن رہے ہو؟ تم اس کی دلہن والی تصویر لائے تھے مگر وہ مرد ہے۔ اس نے داؤد اسرار کی بیٹی کو دلہن بنایا ہے۔“

حارث نے کہا۔ ”تعجب ہے۔ داؤد جیسے ظالم' جابر اور مغرور شخص نے اسے داماد کیسے بنا لیا؟“

”داؤد اس رشتے سے بے خبر ہے۔ بیٹی نے وسیم کو باپ سے چھپا کر رکھا ہے۔ وہ اس محل سے باہر آنا چاہتے ہیں۔“

”آ کر کہاں جائیں گے؟ تم ہمارے حالات دیکھ رہی ہو۔ ہم کہیں ایک پناہ گاہ میں مستقل نہیں رہ پاتے۔ چھپے رہنے کے لیے جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ بیٹی محل سے نکلے گی تو باپ اسے تلاش کرنے کے لیے پورے عراق میں معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بہاتا رہے گا۔“

یاقوت نے کہا۔ ”بڑی مشکل ہے۔ وہ اپنے ملک میں سلامتی سے رہ نہیں پائیں گے۔ کیا سرحد پار کسی دوسرے ملک میں جا سکیں گے؟“

”سرحدیں خطرناک ہو گئی ہیں۔ القاعدہ کے جنگجو چوری چھپے بارڈر کراس کرتے رہتے ہیں۔ وہاں اکثر گولیاں چلتی رہتی ہیں۔“

یاقوت نے فون پر کہا۔ ”وسیم! تم سن رہے ہو' حارث کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں۔ فی الحال ہمارے لیے باہر کہیں جائے پناہ نہیں ہے۔“

حارث نے کہا۔ ”ہم تمہارے لیے فکرمند تھے۔ اب یہ اطمینان ہے کہ جہاں بھی ہو' محفوظ ہو۔ اپنے دشمن کی بیٹی کے ساتھ مردانہ وار زندگی گزار رہے ہو۔ دانش مندی یہ ہوگی کہ فی الحال وہیں چھپ کر رہو۔ حالات سازگار ہوں گے

تب وہاں سے نکلنا مناسب ہوگا۔“

پھر یاقوت کی آواز سنائی دی۔ ”حارث درست کہہ رہے ہیں۔ ہم تمہارے لیے مستقل محفوظ پناہ گاہ تلاش کریں گے۔ ابھی سارہ کے ساتھ وہاں سلامتی سے رہو۔“

سارہ نے فون لے کر کہا۔ ”آپ کا مشورہ ہماری بہتری کے لیے ہے۔ ہم حالات کے بہتر ہونے کا انتظار کریں گے۔ ابھی فون بند کررہی ہوں۔ ہم زیادہ دیر یہاں چھپ کر باتیں نہیں کرسکتے۔ میں فون کی سم بدل رہی ہوں۔ رات کو کسی وقت وسیم سے باتیں ہوسکیں گی۔“

وسیم نے فون کی طرف جھک کر خدا حافظ کہا۔ پھر سارہ نے فون آف کردیا۔ وہ دونوں باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آگئے۔ وسیم بہت خوش تھا۔ اس نے تقریباً دو ہفتے بعد اپنی سسٹر کی آواز سنی تھی۔ یہ حوصلہ پیدا ہوگیا تھا کہ اب وہ بالکل تنہا نہیں ہے۔ محل کی چار دیواری میں سارہ تحفظ فراہم کررہی تھی۔ اب محل کے باہر بھی مضبوط سہارا مل رہا تھا۔ یہ امید تھی کہ یاقوت اور حارث اس کے اور سارہ کے لیے کوئی محفوظ پناہ گاہ ضرور تلاش کریں گے۔

سارہ مایوس تھی۔ وہ کمزور سہارا قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یاقوت اور حارث خود کہیں محفوظ نہیں تھے، جگہ بدلتے رہتے تھے۔ پھر بھلا ان کے لیے کیا کرسکتے تھے؟ وہ شاکر کے بارے میں سوچنے لگی۔ پچھلی رات وہ اپنی اوقات سے باہر ہوگیا تھا۔ تاریکی اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ تب یہ عقل آئی تھی کہ اس نے ایک گارڈ کو راز دار بنا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔

شاکر نے اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کی دست درازی پر وہ اعتراض نہیں کرے گی۔ اگر کرے گی تو وہ بھید کھول دے گا۔ جہاں وسیم چھپا رہتا ہے، وہاں داؤد کو پہنچا دے گا۔

اسے کہتے ہیں اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا۔ اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط شکنجہ خود ہی تیار کیا تھا۔ اب وہ شاکر کی گرفت سے نکل نہیں سکتی تھی۔

اس نے وسیم سے یہ بات چھپائی تھی کہ شاکر حد سے بڑھ چکا ہے اور آئندہ بھی جب چاہے گا، اس سے کھیلنے آجائے گا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیسے اس دلدل سے نکلے؟

یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وسیم کو یہ بات معلوم ہوگی تو وہ برداشت نہیں کرے گا۔ شاکر کو مارنے یا مرنے پر اتر آئے گا۔ وہ خود سوچ رہی تھی کہ مرجائے گی لیکن آئندہ اس کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوگی۔

وہ وسیم کی بہتری چاہتی تھی۔ اسے محل سے باہر یاقوت کے پاس پہنچانا چاہتی تھی اور شاکر ہی اسے تمام گارڈز کی نظروں سے بچا کر وہاں سے نکال سکتا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ شاکر پھر اس سے کسی وقت فون پر بولے گا۔ پھر تنہائی میں ملنے کی خواہش کرے گا۔ تب وہ شرط رکھے گی کہ پہلے وہ وسیم کو محل سے بخیریت نکال کر یاقوت اور حارث کے پاس پہنچائے۔ اس کے بعد وہ تنہائی میں اس سے ملے گی۔ اور تنہائی میں اس کے ساتھ وہ آخری ملاقات ہوگی۔

☆☆☆

شاکر نے پر مارے تھے۔ اونچی اڑان چاہتا تھا مگر زمین پر آگرا تھا۔

مرد... اور عورت کے سامنے گر جائے... یہ توہین برداشت نہیں ہوتی۔ شرمندگی منہ چھپا کر رونے پر مجبور کردیتی ہے۔

جب اسے آپریشن کے ذریعے ناکارہ بنایا گیا تھا، تب سے وہ سوچتا تھا... کیا اس کی زندگی میں کوئی محبت کرنے والی نہیں آئے گی؟

یہ تو صاف سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ نہ ازدواجی زندگی گزار سکے گا، نہ کبھی باپ بن سکے گا۔

اس نے چاہا تھا کہ کسی دوشیزہ پر دل آجائے پھر وہ محبت کے مرحلے سے گزرے گا۔ مگر عجیب بات تھی کہ نہ کوئی نظروں میں سمائی تھی، نہ دل میں اترتی تھی۔

جب اسے سیکیورٹی گارڈ کے طور پر داؤد محل میں رکھا گیا، تب اس نے سارہ کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں سمائی تھی۔ دل میں بھی اتر آئی تھی لیکن یہ چاند کو چھونے والی بات تھی۔ وہ آسمان تھی، یہ زمین تھا۔ پھر یہ کہ پرواز سے پہلے ہی اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔

وہ روز اسے دیکھتا تھا، محسوس کرتا تھا کہ ایک مرد ہے، عاشق ہے۔ تقدیر مہربان ہوجائے تو اسے معشوق بنا سکتا ہے۔

چار برسوں کے بعد تقدیر مہربان ہوئی تھی۔ پہلی بار اس سے فون پر باتیں کرنے کے بعد بڑے جذبے سے سوچتا رہا کہ اسے اتنی محبتیں دے گا کہ وہ اپنے محبوب کو بھول کر صرف اور صرف اسی کے نام ہوجائے گی۔

سوچنا اور بات ہے، سمجھنا اور بات ہے۔ پچھلی رات وہ مجبور ہوکر اس کی گرفت میں آگئی تھی۔ اگر وہ اسے جیت لیتا تو مرد میدان ہوجاتا۔ ان لمحات میں شدت سے شرمندگی بھی ہوئی اور یہ پچھتاوا بھی ہوا کہ جسے جان سے زیادہ چاہتا ہے، اس کا دل دکھایا ہے۔ اس پر جبر کیا ہے۔ اسے کنارے لگانا تھا، بیچ بھنور میں چھوڑ آیا ہے۔

وہ منہ چھپا کر روتا رہا۔ مرد نہیں روتے۔ اسی بات کا رونا تھا کہ ہاتھی کا دانت تھا۔ دکھانے کے لیے تھا، کھانے کے لیے نہیں تھا۔

صبح اس کی ڈیوٹی ختم ہوجاتی تھی۔ وہ کوارٹر میں سونے کے لیے آیا۔ نیند نہیں آسکتی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا، بڑی سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ ’مجھے مرجانا چاہیے۔ میں کس حیثیت سے جی رہا ہوں؟ نہ اِدھر کا ہوں نہ اُدھر کا... جسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں، اسے ایک رات کی بھی مسرتیں نہیں دے سکتا۔ تھو ہے مجھ پر... مجھے مرجانا چاہیے۔‘

اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ ’خدا بہتر جانتا ہے۔ میں سارہ کو سچے دل سے چاہتا ہوں۔ یہ تو معلوم ہوگیا کہ اسے زندگی کی اہم مسرتیں نہیں دے سکوں گا، مگر کچھ تو دے سکتا ہوں۔‘

’وہ اپنے شوہر کے ساتھ محل سے نکل کر سلامتی سے ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہے جبکہ یہ ناممکن ہے۔‘

’عشق تو وہی سچا اور مستحکم ہوتا ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ کوئی اسے تحفظ فراہم نہیں کرسکے گا۔ صرف میں کرسکتا ہوں۔ خدا مجھے حوصلہ دے۔ میں اس کی سلامتی اور بے خوف و خطر ازدواجی زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کرسکتا ہوں۔‘

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کاغذ قلم لے کر لکھنے لگا۔ ان لمحات میں اس کے اندر جذبات بھرے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جذبے سے سوچتا رہا اور لکھتا رہا۔ پھر اس نے کاغذ کو تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ ایسا اطمینان حاصل ہوا جیسے بے لوث محبت کا تمام قرض ادا کرچکا ہو۔

وہ آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ سکون مل گیا، اس لیے جلد ہی گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

شام ڈھل گئی۔ سائے گہرے ہوگئے اور رات کی تاریکی میں بدل گئے۔ پچھلی چار راتوں سے وہاں بڑے خاموش ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ اس رات بھی کچھ ہونے والا تھا۔

داؤد نے بیٹی سے کہا۔ ”تم کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں اسٹڈی روم میں رہوں گا۔“

وہ سمجھ گئی۔ باپ اپنی بیٹی کے سامنے حرم سرا کو اسٹڈی روم کہا کرتا تھا۔ وہ بوتل ہاتھ میں لیے اسی طرف جارہا تھا۔ سارہ رات کا کھانا ٹرالی میں لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ داؤد بوتل کھول کر گلاس بھر رہا تھا اور اس بات پر جھنجلا رہا تھا کہ وہ رات بھی خالی جائے گی۔ جس کم سن لڑکے کو آنا تھا، وہ نہیں آئے گا۔ اسے فون پر اطلاع ملی تھی کہ ابو ولاد مارا گیا ہے۔ فاشی کا اڈا تباہ و برباد ہوگیا ہے۔ کسی بھی دلال سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔

شاکر اپنے وقت کے مطابق ڈیوٹی پر آگیا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کو کھول کر اندر آیا۔ اسے مقفل کیا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا حرم سرا میں آگیا۔ داؤد کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم اجازت لیے بغیر اندر کیوں آئے ہو؟“

وہ بولا۔ ”آج بھی آپ کی رات خالی جائے گی، اس لیے آپ کا پہلو گرم کرنے آیا ہوں۔“

وہ گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ ”کیا بکواس کررہے ہو؟ مرنا چاہتے ہو؟“

”میں تو اسی دن مرگیا تھا جب مجھ سے میری مردانگی چھین لی گئی تھی اور تب سے میں عیاش رئیسوں سے نفرت کرتا آرہا ہوں۔“

داؤد نے میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھایا۔ شاکر نے اپنی گن سیدھی کی۔ اس کا نشانہ لیا پھر کہا۔ ”فون واپس رکھ دو۔ پھر دوبارہ ہاتھ نہ لگانا۔“

وہ فون کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اچانک نمک حرامی کیوں کررہے ہو؟“

”کوئی بات اچانک نہیں ہوتی۔ اس بات کے پیچھے کتنے ہی عوامل کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں جب بھی کسی لڑکے کو لایا جاتا ہے تو میرے اندر سانپ پھنکارنے لگتا ہے۔ زخم تازہ ہوجاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسی ہی زیادتیاں کی گئی تھیں۔ میں تمہارے جیسے درندے کو مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن...“

وہ ذرا چپ ہوا تو داؤد نے کہا۔ ”تمہارے اس لیکن کے پیچھے مجھے ہلاک نہ کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ کوئی سمجھوتا ہوسکتا ہے تو بولو؟“

”ہاں۔ بہت بڑی، بہت اہم وجہ ہے۔ تمہاری بیٹی نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔“

وہ غصے سے دہاڑتا ہوا اٹھا۔ ”ذلیل... کمینے! میری بیٹی کا نام زبان پر...“

بات پوری ہونے سے پہلے ہی گن کا دستہ منہ پر پڑا۔ وہ پیچھے صوفے پر گر پڑا۔ پیشانی پر ضرب لگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے قمقمے جلنے بجھنے لگے تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔ پیشانی پر بہتے ہوئے لہو کی گرمی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے ذرا دیر بعد کراہ کر آنکھیں کھولیں۔

شاکر نے بھرا ہوا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ ”پیشانی پر گومڑ نکل رہا ہے۔ پیو۔ تکلیف کم ہوجائے گی۔“

اس نے غصے اور بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے لے کر پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی۔

شاکر نے میز پر گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ ”رسی جل

جائے گی' بل نہیں جائیں گے۔تُو اپنی رات کالی کرنے کے لیے وسیم کو یہاں لایا تھا۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہاں سے فرار نہیں ہوا ہے۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔تم سب نے اسے پورے محل میں تلاش کیا ہے۔''

اس نے پھر بوتل کو منہ سے لگایا۔شاکر نے کہا۔''اور میں تلاش کرنے والا ہی کہہ رہا ہوں' وہ اس وقت تیری بیٹی کے بستر پر موجود ہے۔''

اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔منہ سے بوتل نکل گئی وہ ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گئی۔ایسا زبردست جھٹکا لگا تھا کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے کھانستے دُہرا ہو رہا تھا۔

وہ کمزور نہیں تھا لیکن اس رات نہتا حرم سرا میں آیا تھا اور خسرے گارڈ کی گن کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ جب کھانسی تھمنے لگی تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔''سارہ کے کمرے میں چلو۔ اگر وہ کتا وہاں ہوگا تو...''

وہ آگے نہ بول سکا۔منہ پر گھونسہ پڑا۔وہ اٹھ رہا تھا پھر بیٹھ گیا۔شاکر نے کہا۔''میری سارہ حیادالی ہے۔کوئی گناہ نہیں کر رہی۔اس نے وسیم سے نکاح قبول کیا ہے۔تجھ سے نجات ملتے ہی باقاعدہ نکاح پڑھوائے گی۔''

یہ کہتے ہی اس نے پھر گن کے دستے سے اس کے منہ پر' گردن پر اور سر پر پے در پے ضربیں لگائیں۔وہ بے دم سا ہو کر قالین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔شاکر نے گن کی نال اس کے سینے پر رکھ کر کہا۔''تو کبھی سارہ کو اس کی مرضی سے ازدواجی زندگی گزارنے نہ دیتا۔وہ بے چاری پریشان ہو رہی تھی کہ جہاں جائے گی' اپنے وسیم کے ساتھ ماری جائے گی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔تُو یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا کہ بازی کیسے پلٹ گئی ہے۔''

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر دبایا۔رات کے سناٹے میں فائر کی آواز دور تک گونجی ہوگی۔وہ تیزی سے چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا سارہ کے دروازے پر آیا۔پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔''میں شاکر ہوں۔دروازہ کھولو۔''

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔سارہ نے کہا۔''میں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔''

''ہاں۔میں نے چلائی تھی۔''

اس نے جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔''دروازہ بند کر لو اور اسے وسیم کے ساتھ پڑھو۔ میں تمہیں آخری بار حسرت سے دیکھ رہا ہوں اور دعا دے رہا ہوں کہ خدا تمہیں وسیم کے ساتھ شاد و آباد رکھے۔''

باہر سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔وہ پلٹ کر دوڑتا ہوا ادھر آیا۔سیکیورٹی افسر کہہ رہا تھا۔''شاکر! تم اندر ہو۔کیا تم نے گولی چلائی ہے؟ عالی جناب فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔تم کہاں ہو؟ دروازہ کھولو۔''

اس نے دروازہ کھول کر کہا۔''وہ حرم سرا میں ہیں۔''

سیکیورٹی افسر اور گارڈز دوڑتے ہوئے ادھر گئے۔شاکر باہر جانے لگا۔ایک منٹ کے اندر ہی سیکیورٹی افسر چیختا ہوا آیا۔''شاکر کو گرفتار کرو۔اس نے عالی جناب کو گولی ماری ہے۔''

کئی گارڈز نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔''شاکر! اپنی گن پھینک دو۔''

وہ ان سے دور جا رہا تھا۔رک گیا۔پلٹ کر محل کو یوں دیکھنے لگا جیسے سارہ کو حسرت سے دیکھ رہا ہو۔پھر اس نے گن کا رخ گارڈز کی طرف کرتے ہوئے کہا۔''آہ سارہ! تجھے سارا تو کیا آدھا بھی نہ پا سکا۔''

اس نے ایک گولی چلائی۔جواب میں کئی گولیوں نے شور مچاتے ہوئے اسے چھلنی کر ڈالا۔

سارہ اور وسیم بند کمرے میں دیوانے عاشق کی تحریر پڑھ رہے تھے۔

اس نے لکھا تھا۔''میری زندگی! تمہارے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟

''ہرگز نہیں۔تم نہیں ہو تو کچھ بھی نہیں ہے۔بس موت کا سناٹا...

''میں تمہاری آزاد ازدواجی زندگی کے لیے راست[ہ] ہموار کر چکا ہوں۔میری چند ہدایات پر فوراً عمل کرو۔

''آج کے بعد تم اس محل کی اور اپنے باپ کی تما[م] دولت وجائداد کی مالک بن جاؤ گی۔

''سب سے پہلے گارڈز تبدیل کرو۔جو موجود ہیں انہیں یہاں سے نکالو۔نئے گارڈز آئیں گے تو وسیم کو تمہا[را] شوہر تسلیم کریں گے۔تم یہاں کی خود مختار مالک بن چکی ہوگی تمہارے آگے کوئی زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرے گا تمہاری مرضی کے بغیر کوئی رشتے دار یہاں قدم نہیں رکھے گا۔

''تم بالغ ہو۔تمہاری شادی کو قانوناً بھی تسلیم کیا جائے گا

''اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ حالات نے اچانک کیسے پلٹا کھایا ہے...؟

''میں نے تمہارے بدکار باپ کو جہنم میں پہنچا دیا ہے

سارہ کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔اسی وقت با[ہر] سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کا شور سنائی دیا۔وہ دیوانہ چھلنی ہو رہا تھا